تعلیم و تربیت
نومبر 2006ء
عید مبارک
صوفی نیاز مند کے مہمان
صفحہ 25 پر
صفحہ 5 پر
سوال
صفحہ 40 پر
دم ہے تو!
صفحہ 36 پر
انتقام
صفحہ 60 پر

عید میلہ

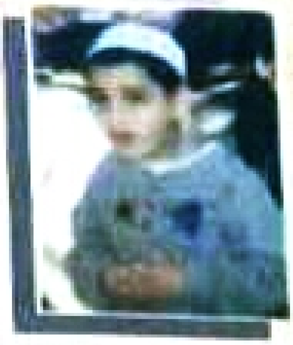

عید ہے اور عید کے تہوار میں
ہو رہی ہے ہاؤ ہو بازار میں

عید میلہ لگ رہا ہے ہر طرف
ہر کوئی مصروف کاروبار میں

شاہی مسجد، شاہی قلعہ، چڑیا گھر
بھیڑ ہے لوگوں کی شالامار میں

موج میں ہیں شہر کے چھوٹے بڑے
سیر کرتے پھر رہے ہیں کار میں

بانٹتے ہیں عید کے تحفے ہمیں
شہر کے ہر مفلس و نادار میں

میرے بچو یاد رکھنا ہے اُنھیں
وہ جو ہیں مشکل میں اور آزار میں

کرامت بخاری

مفلس: غریب
آزار: تکلیف

عید کا چاند

چار سالہ چاند میاں نے دادو کے کمرے میں جھانکا۔ انہیں دادو سے کام تھا مگر وہ کمرے میں نہیں تھیں۔ ابھی وہ واپس پلٹنے کو تھے کہ اچانک ان کی نظر دادو کے ٹرنک پر پڑی۔ ارے ...... ان کی باچھیں کھل گئیں۔ آج دادو کے ٹرنک پر تالا نہیں تھا۔ اصل میں دادو اپنے اس بڑے سے ٹرنک میں گاجر کا حلوہ، سیب کا مربہ اور کھوئے کی برفی جیسی سوغاتیں چھپا کر رکھتی تھیں اور چاند میاں کو یہ ساری چیزیں ہی بہت پسند تھیں۔ مگر دادو کبھی انہیں حصے سے زیادہ نہیں دیتی تھیں۔ کھوئے کی برفی یا گاجر کا ڈھیر سارا خشک حلوہ تقریباً ہر ماہ ہی بنتا تھا۔ لیکن سب کو ان کا حصہ دینے کے بعد دادو باقی کا سارا حلوہ ایک بڑے سے ایئر ٹائٹ جار میں بند کر دیتیں اور اسے ٹرنک میں رکھ کر تالا ڈال دیتیں۔ وجہ یہ تھی کہ دادو کے کمرے میں کوئی الماری نہیں تھی۔ اور وہ پرانے زمانے کی عورت تھیں۔ انہیں الماری کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ عمرو عیار کی زنبیل کی طرح وہ ہر کام کے لئے اپنا ٹرنک ہی استعمال کر لیتی تھیں۔ دادو کے رکھے ہوئے یہ حلوے اور مٹھائیاں مہمانوں کی آمد پر یا کسی وقت چائے یا ناشتے پر بڑے قرینے سے استعمال ہوتے تھے۔ چاند میاں جو اس گھر کے پہلے پہلے اور بے حد لاڈلے سے پوتے تھے، ان سے دادو بھی کچھ نہ چھپاتی تھیں۔ لیکن وہ بھی تو ہر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد اپنا فرمائشی پروگرام لے کر پہنچ جاتے تھے پھر دادو کیا کرتیں۔

تو اس وقت سنہری موقع تھا چاند میاں کے لئے کہ دادو بھی نہیں تھیں اور جان کا دشمن تالا بھی کھلا ہوا تھا۔ میز پر چڑھ کر انہوں نے بمشکل تمام ٹرنک کا بھاری ڈھکنا اٹھایا۔ سامنے ہی حلوے کا منہ بند جار رکھا تھا۔ انہوں نے جھک کر جار پکڑنا چاہا۔ مگر وہ کافی نیچے تھا۔ وہ جھکے، اور جھکے اور ...... اور جھکے اور غڑاپ سے ٹرنک کے اندر۔ اور اسی وقت ایک اور حادثہ ہوا کہ ایک پُرشور آواز کے ساتھ ٹرنک کا ڈھکنا نیچے آ گرا۔ وہ تو شکر ہوا کہ ٹرنک کے کنڈے بیچ میں آ پھنسے تھے ورنہ شاید دم گھٹ کر رہ جاتا۔ چاند میاں نے حسب معمول بڑا سا منہ کھول کر رونا چاہا۔ مگر اسی وقت کہیں دور سے دادو کی آواز آئی۔ "ارری شبانہ دیکھیو تو ...... کہیں کچھ گرا ہے۔" شاید دادو ٹی وی لاؤنج میں تھیں۔ "کچھ نہیں اماں ...... گھر سے باہر کہیں کچھ گرا ہو گا۔" چاند میاں کی پھپھو شبانہ کچن میں شامی کبابوں سے نبرد آزما تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولیں۔

اوسان ذرا بحال ہوئے تو چاند میاں کو اپنا بھولا ہوا مشن یاد آیا۔ جھٹ سے انہوں نے جار کھولا اور دونوں ہاتھوں سے حلوہ کھانے

گے۔ وہ بے قرار تو چاند کی پہلی رات تک پیچھا چھوڑ دیتی اپنی
طرف چلے گئے۔ نرم گرم بچھونوں پر لیٹ کر سب سو گئے
اتنی کچھ باقی نہیں بچا۔
آج انتیسواں روزہ تھا۔ آج شاید ہی کوئی عید ہو جائے گی۔
ان کے چاند دیکھنے کیلئے بہت سے بچے جمع تھے مگر چاند نظر نہ آیا
میں قریب ہی تھے اور افطار کے بعد کھانا کھا کر گھر سے باہر
نکلے۔ "کہاں گئے ... چاند کہاں ہے؟" دادو بولیں۔ دونوں
بچے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

"کب بچی میں نے بھی اسے کافی دیر سے نہیں دیکھا ہے۔
تو بھی تمہارے پاس ہے۔" وہ ریموٹ سے ٹی وی کی آواز کم
کرتے ہوئے بولی۔ جس پر اس وقت تقسیم ... شریف چل رہا
تھا۔ ہیں فون پر تھی۔ "اچھا ... وہ اپنی بیگم کے ساتھ عید کا
چاند دیکھنے چلا گیا ہو گا۔ میں نے تو اسے آپ کے پاس بھیجا تھا کہ جا کر
دادو سے پوچھے۔" اس کی باتیں سن کر بتا رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے وہ بیگم کے ساتھ پارک گیا ہوا ہے۔" رضا
پھوپھی نے بچوں کی واپسی کے لئے کر آئی تھیں۔ اصل میں چاند
میاں کچھ دیر ہونے کے بعد ہی عید منا رہے تھے۔ اس لئے
عید کا چاند کب نکلتا ہے، کیسا ہوتا ہے، عید کیسے مناتے ہیں؟ یہ
سارے سوال ان کے لئے بہت اہم تھے۔ کچھ دیر بعد افطاری کے
لئے دادا، پاپا اور دونوں چچا سب ہی جمع ہو گئے۔ لیکن چاند کسی کے
ساتھ بھی نہیں تھا۔

"کہ چاند کہاں ہے، تمہارے ساتھ نہیں، ہم تو سمجھے
تمہارے ساتھ ہو گا؟" ہر کوئی ایک دوسرے سے پوچھ رہا تھا۔ چاند
میاں ابھی چھوٹے تھے اور اکیلے گھر سے باہر بھی نہیں نکلتے تھے۔
دونوں چاچو گھبرا کر انہیں قریبی پڑوس کے گھروں میں ڈھونڈنے
چل پڑے۔ دادا مسجد کی طرف گئے تو پاپا جنرل سٹور کی طرف اور
ان کے منہ سے جس نے بھی سنا کہ چاند میاں نہیں مل رہے وہ
بھی اس تلاش میں ان کا ہمرکاب ہو گیا۔ محلے کی دونوں مسجدوں میں
بار بار اعلان دہرایا جانے لگا کہ جس کسی کے پاس چاند میاں ہوں وہ
انہیں ان کے گھر چھوڑ جائے کیونکہ بچے کے لواحقین سخت پریشان
ہیں۔ لیکن چاند میاں کی کچھ خبر نہ تھی۔

وہ محلے کی کچھ عورتیں اور قریبی ہمسائے گھر والوں کو دلاسا
دینے آ پہنچے تھے۔ ہر طرف طرح طرح کی باتیں تھیں اور بھانت
بھانت کے تبصرے۔ کسی نے آج کل کی گلیوں سے بچے اٹھائے جانے
سے ہیں۔" ایک عورت نے اپنی بات شروع کی ... ہو کر کہا۔
"ہاں بی ... سنا ہے فقیروں کا بچوں کو معلوم کر رہا ہے ... سب
کچھ کر رہا ہے۔" دوسری نے ہاں میں ہاں ملائی۔
"کسے میں نے تو خود اخبار میں پڑھا ہے۔ فقیر بچوں کے
کرتے ہیں ان کو کسی سے بھی ... " تیسری نے
اپنے علم کا مظاہرہ کیا۔ "نہیں ... نہیں ... نہیں۔ میرے بچے کو
کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہوگا میرے لال کو۔" امی ہسٹیریکل ہو کر
چلانے لگیں۔ شاید چھپو پر تو جیسے غشی سی طاری ہونے لگی۔ دادا
چھپو انہیں سنبھال رہی تھیں۔ دادو نے یہ حال دیکھا تو سب کو وہاں
سے ہٹانا ہی مناسب سمجھا۔ وہ اسے لے کر اپنے کمرے میں چلی
گئیں۔ "منحوسوں، ہمدردی کرنے آئی ہیں یا جان لینے۔" وہ بڑبڑا
رہی تھیں۔ "آ بہو تو یہاں بیٹھ۔ ہمارا چاند یہیں کہیں کھیل رہا ہو گا
گھبرا مت، خدا کو یاد کر۔ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ ضرور ہماری سنے
گا۔" اپنے بولتے ہوئے دل کو سنبھالتے ہوئے وہ چاند میاں کی امی

کو رلائے دے رہی تھیں۔ نہیں
دادی کی ہر دعا پا کر دور تک
دیکھیں۔ کہاں میرا بچہ... کہاں
ہو گا میرا بچہ لال... وہ تو کبھی گھر
سے بھی نہیں نکلا اکیلا... راستوں
سے انجان، کہاں بھٹک رہا ہو گا۔
مجھے میرا بچہ لا دیجیے لال۔ مجھے
میرا بچہ لا دیجیے۔"

"نہ میری بچی! مت رو، اس طرح مت رو، کہیں نہیں جائے گا ہمارا بچہ۔ نعیم اور سلیم گئے ہیں، ہم پاس پڑوس دیکھنے۔ بیٹھا ہو گا کسی بچے کے پاس۔" دادو ان کا سر اپنے سینے سے لگا کر بولیں۔ "بیٹا ابھی تو ننھا ہے، جو دیکھتا ہے اٹھا لیتا ہے، پیار کرنے لگتا ہے۔" بیچاری پھپھو ان دونوں کے لیے پانی میں گلوکوز ملا کر لائی تھیں۔

"صبح سے پوچھ رہا تھا عید کا چاند کب نکلے گا۔ میں نے اسے آپ کے پاس بھیجا تھا کہ جا کر دادو سے پوچھ لو۔" امی کا رو رو کر برا حال تھا۔ "مت رو! بہو مت رو ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ ارے... دیکھیو تو... یہ موئی نصیبن نے دوپہر کو ٹرنک کھولا تھا کپڑے رکھنے کے لیے اور ڈھکنا اب تک کھلا ہے۔ اے شبانہ ذرا ٹرنک بیگ سے بند کر دیو۔ کہیں کوئی چوہا ہی نہ گھس جائے۔" بہو کو چپ کراتے دادو کی نظر اچانک ٹرنک پر پڑی تھی۔ پھپھو اپنے آنسو پونچھتے ہوئے آگے بڑھیں۔ پھنسے ہوئے کنڈے نکالنے کے لیے انہوں نے ڈھکنا کھولا تو چلا کر رہ گئیں۔ "حلوہ چور... یہاں سو رہا ہے۔" روتے روتے وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی تھیں۔ "کیا ہوا شبانہ؟" دادو نے حیرت سے پوچھا۔ "امی... آپ کا چاند۔" انہوں نے چاند میاں کو اٹھا کر دادو کی گود میں ڈال دیا۔ اسی وقت باہر گلے کی چھتوں پر ایک شور اٹھا، "مل گیا... مل گیا... وہ رہا چاند۔ مبارک ہو چاند مل گیا۔"

"مبارک ہو بہو۔ ہمیں بھی ہمارا چاند مل گیا۔" دادو چاند میاں کا ماتھا چومتے ہوئے خوشی کے آنسو بہا رہی تھیں۔ "دادو... چاند مل گیا؟" چاند میاں نے مچل کر ان کی گود سے نکلتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں بیٹا مل گیا۔" چاند میاں ان کی بات سے بغیر سیڑھیوں کی طرف بھاگ چکے تھے۔

"صبح سے ڈھونڈ رہا تھا اب ملا ہے چاند۔" وہ کہہ رہے تھے۔ پھپھو اور امی بے اختیار ہنسنے لگیں۔ "بیٹا ابھی عید کے چاند کا اعلان ہو گا۔ کسی سے کہہ کر اپنے چاند کے مل جانے کا بھی اعلان کرا دو۔ تاکہ اس کی تلاش میں نکلے ہوئے تمہارے ابا اور بھائی گھر آ جائیں۔ ابھی تک کسی نے ڈھنگ سے روزہ افطار نہیں کیا۔" دادو شبانہ پھپھو سے کہہ رہی تھیں۔

چھت پر ہی چاند میاں کے ساتھ عید کا چاند دیکھتے ہوئے، اپنے چاند کی خیریت اور درازی عمر کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

پہلا سبق

نذیر انبالوی

ڈھول کی تھاپ پر چوہدری مبارک کے کارندے دھمال ڈالتے ہوئے میلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"تیز ڈھول بجاؤ۔" چوہدری مبارک چلایا۔

ڈھول کی آواز تیز ہوئی تو دھمال ڈالنے والے بھی مزید جوش میں آگئے تھے۔ یہ لوگ جہاں جہاں سے گزر رہے تھے لوگ کھڑے ہو کر انھیں دیکھ رہے تھے۔ ان لوگوں کے لیے یہ منظر کوئی نئی بات نہ تھی۔

"دیکھو آج کیا ہوتا ہے؟" ماموں کریانہ والے کی دکان پر کھڑے طفیل نے شوکت کو مخاطب کیا۔

"میرا خیال ہے اس مرتبہ جوڑ برابر کا ہے۔" شوکت بولا۔

"نہیں نہ اس مرتبہ بھی چوہدری اقبال کا کتا لے دن ہے۔"

یہ آواز قمر کی تھی۔

"تم ٹھیک نہیں کہہ رہے، کتے دونوں برابر کے ہیں۔" طفیل بولا۔

وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ چوہدری اقبال بھی اپنے بیلیوں کے ساتھ ڈھول کی تھاپ پر میلے کی طرف رواں ہوا۔ چوہدری اقبال کے سر پر ایک پگڑی تھی جس کا شملہ چوہدری کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی مونچھوں کو بار بار تاؤ دے رہا تھا۔

"میں دیکھوں گا کہ آج موتی کو کون شکست دے گا۔" چوہدری اقبال نے موتی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"چوہدری جی پچھلے سال کی طرح اس بار بھی فتح موتی کی ہو گی۔" چوہدری کے خاص بندے راجو نے موتی کی زنجیر کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے موتی اپنے دشمن سے ٹکرانے کے لیے بے چین ہے اسی لیے تو تمہارے ہاتھوں میں بے چین ہوتے جا رہا ہے۔" چوہدری اقبال بولا۔

"چوہدری جی ایسی ہی بات ہے۔ میں نے سال بھر اس پر خوب محنت کی ہے۔ یہ اپنے دشمن کو شکست دے کر فاتح بن کر لوٹے گا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی ہے۔" راجو کی بات سن کر چوہدری اقبال نے کہا۔

"راجو ایسا ہی ہو گا۔"

اب میلہ کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ نہر کے ساتھ ساتھ بہت سی دکانیں مصنوعی تھیں جن میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد خریداری میں مصروف تھی۔ یہ میلہ ہر سال بابا سبز شاہ کے مزار پر سردیوں کے آغاز پر لگتا تھا۔ بچوں بڑوں کی دلچسپی کا بہت سا سامان اس میلے میں موجود ہوتا تھا۔ سرکس، موت کا کنواں، جھگے شو اور جھولے خاص طور پر لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہوتے تھے۔ ان دلچسپیوں

کے علاوہ ہر سال لوگوں کو جن دو مقابلوں کا شدت سے انتظار ہوتا تھا ان میں کشتی، کبڈی اور کتوں کی لڑائی قابل ذکر تھیں۔ ابتدائی طور پر بہت سے کتوں کے درمیان مقابلہ ہوتا پھر ان میں سے بہتر کتوں کا سیمی فائنل اور پھر فائنل کے لیے انتخاب کیا جاتا۔ پچھلے کئی برسوں سے چوہدری اقبال اور چوہدری مبارک کے کتے فائنل تک پہنچ رہے تھے۔ اس سال بھی دونوں کے ہی کتے فائنل تک پہنچے تھے۔ دونوں چوہدری کتوں کی اس لڑائی کے لیے اتنا سنجیدہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے اس کو اپنی عزت بے عزتی کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ دونوں نے کتوں کی دیکھ بھال کے لیے خصوصی ملازموں کو رکھا تھا۔ کتوں کی خوراک کا بہترین انتظام تھا۔ جب ان کو کسی اعلیٰ نسل کے کتے کا پتا چلتا وہ اس کو خریدنے کے لیے بے تاب ہو جاتے۔ کچھ عرصہ قبل ہی لاہور سے ایک شخص کتوں کے پلے لے کر چوہدری مبارک کے گاؤں پہنچا تو کسی طرح چوہدری اقبال کو اس بات کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے خصوصی طور پر ایک بندے کو اس مقصد کے لیے بھیجا کہ وہ منہ مانگے داموں دے کر کتے کے پلے خرید لائے۔ اس بندے نے آنے میں دیر کر دی تھی کیونکہ چوہدری مبارک پلے خرید چکا تھا۔

اب دونوں چوہدری میلے میں آمنے سامنے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کے کارندے چاق و چوبند کھڑے تھے۔ کتے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے بے چین تھے۔

"کیوں اپنے کتے کو مروانے کا ارادہ ہے، یہ چوہا میرے شیر کا کیا مقابلہ کرے گا۔" چوہدری مبارک نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"چوہا۔" چوہدری اقبال نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا تو اس قہقہے میں اس کے وفاداروں نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔

"میں ٹھیک تو کہہ رہا ہوں، یہ چوہا..."

"بس آگے کچھ مت کہنا میدان لگے گا تو پھر دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا کہ کون چوہا ہے اور کون شیر۔ میرا موتی کل بھی شیر تھا اور آج بھی شیر ہے۔" چوہدری اقبال غرایا۔

"اب بھی موقع ہے اپنے موتی کو میرے ٹائیگر سے بچا لو یہ پچھلے سال والا ٹائیگر نہیں ہے، یہ فولاد ہے فولاد اس کے سامنے موتی تو کچھ بھی نہیں۔" چوہدری مبارک نے اپنے ٹائیگر کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ابھی یہ گرما گرم جملوں کا تبادلہ جاری تھا کہ میلے کی انتظامیہ نے موتی اور ٹائیگر کی لڑائی کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ اعلان سن کر لوگ تیزی سے مقابلے کے میدان کی طرف بڑھنے لگے۔ دونوں کتوں کو جب میدان میں لڑائی کے لیے چھوڑا گیا تو تماشائیوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ دونوں پارٹیوں کے حامی نعرے بازی میں مصروف تھے۔ کہیں سے آواز آ رہی تھی کہ "موتی ہمارا شیر ہے باقی سب ہیر پھیر" ٹائیگر کے حامی اس کے لیے نعرے بلند کر رہے تھے۔ جب مقابلہ ختم ہوا تو ٹائیگر نے موتی کو مار بھگایا تھا۔ جب موتی اپنی جان بچانے کے لیے پیچھے کی طرف پلٹا تو چوہدری اقبال نے شور مچایا۔

"موتی ہمت کرو، آگے بڑھو۔"

جب کہ چوہدری مبارک بار بار چلا رہا تھا۔

"ٹائیگر دشمن کو مار بھگاؤ، ٹائیگر آگے بڑھو۔"

جیوری کے فیصلے کے مطابق ٹائیگر کو فاتح قرار دیا گیا۔ چوہدری اقبال کب اپنی شکست تسلیم کرنے والا تھا۔ اس نے اپنے ملازموں کو اشارہ کیا تو وہ حملہ کرنے کے لیے چوہدری مبارک کی طرف بڑھے۔ ان کے ایسا کرنے کی دیر تھی کہ کتوں کی لڑائی کا میدان انسانوں کی لڑائی میں بدل گیا تھا۔ اس لڑائی میں دونوں چوہدری تو محفوظ رہے مگر ان کے کئی کارندے زخمی ہو گئے۔ اس لڑائی کی خبر دونوں کے بیٹوں تک بھی جا پہنچی تھی۔ دونوں شہر کے ایک بہترین تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم تھے۔ دونوں ہاسٹل میں رہتے تھے۔ جب چوہدری مبارک کو علم ہوا تھا کہ چوہدری اقبال کا بیٹا گرین پبلک سکول میں تعلیم حاصل کر رہا ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی سکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اس نے جب ایسا کیا تو منشی ریاض نے پوچھا تھا کہ انھوں نے اسی سکول میں اپنے بیٹے کو کیوں داخل کروایا ہے جہاں سے پہلے چوہدری اقبال کا بیٹا زیر تعلیم ہے۔ اس کے جواب میں چوہدری مبارک نے کہا تھا کہ یہ ملک کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے وہاں چوہدری اقبال کا بیٹا پڑھ سکتا ہے تو میرا بیٹا کیوں نہیں۔ اس نے پہلے دن ہی اپنے بیٹے کو کہہ دیا تھا کہ وہ چوہدری اقبال کے بیٹے سے دور رہے مگر یہاں تو صورت حال

ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔ دونوں قائداعظم ہاؤس میں تھے۔ دونوں کو اسمبلی میں ایک جگہ ہی کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ چوہدری اقبال نے اپنے بیٹے کا ہاؤس تبدیل کروانے کی کوشش کی مگر ایسا نہ ہو سکا۔

نومبر کے آخر میں اسکول میں کھیلوں کے مقابلے شروع ہوئے۔ اسکول کے مختلف ہاؤسز نے بہت سے کھیلوں میں حصہ لیا تھا۔ قائداعظم ہاؤس کا پہلا کرکٹ میچ لودھی ہاؤس سے تھا۔ چوہدری اقبال کا بیٹا دانیال اور چوہدری مبارک کا بیٹا لیاقت ٹیم میں شامل تھے۔ دانیال نے افتتاحی بلے باز کی حیثیت سے کھیل کا آغاز کیا تھا۔ اس کے ساتھی کھلاڑی جلد آؤٹ ہو گئے تھے اس لیے چوتھے نمبر پر لیاقت میدان میں موجود تھا۔ دونوں دشمنوں کے بیٹے بیٹنگ کر رہے تھے۔ دانیال نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ وہ لیاقت کو جان بوجھ کر رن آؤٹ کروا دے مگر اگلے ہی لمحے اس نے اس سوچ کو جھٹک دیا کیونکہ ایسا کرنے سے ان کے ہاؤس کا نقصان تھا۔ دونوں نے جم کر بیٹنگ کی اور اپنے ہاؤس کے لیے مقررہ اوورز میں دو سو رنز بنا کر اپنے ہاؤس کی پوزیشن مضبوط کر دی۔ ان کا ہاؤس آسانی سے یہ میچ جیت گیا۔ دانیال کو مجموعی کارکردگی کی بنیاد پر میچ کا بہترین کھلاڑی قرار دیا گیا۔

"دانیال تمہیں بہت مبارک ہو۔" لیاقت نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بھی مبارک ہو۔ اس جیت میں تم میرے برابر کے شریک ہو۔" دونوں کے ہاتھ ملانے کی دیر تھی کہ اس مبارک گھڑی ان کے درمیان دوستی جیسے عظیم اور انمول رشتے نے جنم لے لیا تھا۔ دونوں ایک ہی عمارت میں رہتے ہوئے پہلے جتنے دور تھے اب اتنے ہی قریب آ گئے تھے۔ جب سپورٹس ڈے کے موقع پر ان کے ہاؤس کو بہترین ہاؤس کا انعام دیا گیا تو دونوں بہت خوش تھے۔ یہ جس قدر قریب ہوتے جا رہے تھے ان کے والد اسی قدر ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ جب میلے میں موتی اور ٹائیگر کی لڑائی کی خبر ان کو ملی تھی تو لیاقت نے ازراہِ مذاق دانیال سے کہا۔

"دیکھا ہمارے ٹائیگر کا کمال موتی کو نانی یاد کروا دی ہے۔"

"میں ایک ہاتھ دوں گا تو تمہیں اپنی نانی یاد آ جائے گی۔" دانیال تو سنجیدہ ہی ہو گیا تھا۔

"بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا۔ جو آگ ہمارے والد لگائے بیٹھے ہیں ہمیں اس آگ کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔ ہمیں دشمنی کی اس

آگ کو بجھانا چاہیے۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" دانیال نے پوچھا۔

"ہاں ایسا ممکن ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ہم کریں گے۔"

دانیال ساری بات سن کر بولا۔

"کیا کوئی خطرہ تو نہیں ہو گا؟"

"کچھ حاصل کرنے کے لیے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہمیں اس سلسلے میں بزرگوں سے بھی مشورہ کرنا چاہیے۔" لیاقت بولا۔

سردیوں کی چھٹیوں میں دونوں اپنے اپنے گاؤں پہنچے۔ دونوں کا موبائل فون کے ذریعے رابطہ تھا۔ انھوں نے گاؤں آتے ہی اپنے مشن پر کام شروع کر دیا تھا۔

"کیا بک رہے ہو؟" چوہدری مبارک چلایا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں کہ ٹائیگر غائب ہے۔"

"کہاں گیا ہے میرا ٹائیگر۔" ملازم کی بات سن کر چوہدری مبارک دھاڑا۔

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"یہ ضرور چوہدری اقبال کی کارروائی ہے۔ وہ اپنے موتی کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ میں اب اس سے ایسا بدلہ لوں گا کہ وہ عمر بھر یاد رکھے گا۔" چوہدری مبارک غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

لیاقت یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے دانیال سے موبائل فون پر رابطہ کر کے صورت حال معلوم کی تو اس نے بتایا تھا کہ اس کے والد چوہدری اقبال بھی چوہدری مبارک کی طرح اپنے کتے کی پراسرار گمشدگی پر غصے سے بے قابو ہو رہے ہیں۔

"اب غصے سے بے قابو ہونے والوں کو سنبھالنا ہم دونوں کی ذمہ داری ہے۔" لیاقت نے دانیال کو سمجھایا۔

"ہاں ہم دونوں نے یہ کام کرنا ہے، چلو اب باتیں ختم اور کام شروع۔ ہمیں اپنے اپنے محاذ پر ڈٹ جانا چاہیے۔" دانیال بولا۔

اب دونوں اپنے اپنے والد کے سامنے موجود تھے۔ دونوں ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

"میں اگر کہوں کہ آپ کا کتا چوہدری اقبال نے نہیں چرایا تو ۔۔۔"

"میں یہ نہیں مان سکتا یہ حرکت اس کی ہے۔" چوہدری مبارک نے اپنے بیٹے کی بات بھی پوری نہ ہونے دی تھی۔

"چوہدری اقبال کا بھی تو یہی کہنا ہے کہ آپ نے ان کا موتی چرایا ہے۔"

"یہ جھوٹی اور بے بنیاد بات ہے، میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"تو چوہدری اقبال نے بھی آپ کا کتا نہیں چرایا۔" لیاقت نے جواب دیا۔

"تم یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو۔" چوہدری مبارک نے لیاقت کو گھورا۔

"بس مجھے یقین ہے کہ چوہدری اقبال نے ہمارا کتا غائب نہیں کرایا۔ آپ تحمل کا مظاہرہ کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" لیاقت نے کہا۔

"میں چوہدری اقبال کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ آپ چوہدری اقبال کو نہ چھوڑیں۔ آپ مجھے کچھ وقت دیں میں ٹائیگر کا خود سراغ لگاؤں گا۔"

"تم یہ کام کرو گے۔" چوہدری مبارک کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں میں یہ کام کروں گا۔ آپ مجھے صرف ایک ہفتے کا وقت دیں میں جب ناکام ہو جاؤں گا تو پھر آپ جیسا کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔" چوہدری مبارک اپنے بیٹے کی بات سن کر سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ اس نے چند منٹ سوچا اور پھر لیاقت کو ایک ہفتے کا وقت دے دیا۔ ادھر دانیال نے بھی اپنے والد سے بھی موتی کا سراغ لگانے کے لیے ایک ہفتے کا وقت لے لیا تھا۔ دونوں بڑی تیزی کے ساتھ اپنے منصوبے کو تکمیل کی طرف لے جا رہے تھے۔ ان کا آپس میں مسلسل رابطہ تھا۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد دونوں نے کتوں کے ملنے کی اپنے اپنے والد کو اطلاع دی تھی۔

"کیا میرا موتی مل گیا ہے؟" چوہدری اقبال کی خوشی دیدنی تھی۔

"ہاں ابو جان ایسا ہو گیا ہے۔"

"کہاں ہے میرا موتی؟" چوہدری اقبال بے چین ہوئے جا رہا تھا۔

"اسی علاقے میں آپ کا موتی ہے۔"

"کس کے پاس ہے میرا موتی میں اس کو نہیں چھوڑوں

کہ "چوہدری اقبال کا لہجہ ایک دم بدل گیا تھا۔
"ابو جان، فکر نہ کریں، چند گھنٹوں بعد آپ کو موتی مل جائے گا۔" دانیال بولا۔

شام کے وقت طے شدہ پروگرام کے مطابق دانیال، چوہدری اقبال اور لیاقت، چوہدری مبارک کے ساتھ نمبر کے ساتھ پرانی حویلی میں موجود تھے۔ دانیال اور لیاقت نے آپس میں ہاتھ ملایا تو دونوں کے والد نے انھیں گھورا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان کے بیٹے انھیں یہاں کیوں لائے ہیں۔ وہ ابھی حیرت کے سمندر میں گم تھے کہ لیاقت نے اپنے والد چوہدری مبارک کو مخاطب کیا تھا۔

"ابو جان اس کھڑکی سے اپنے ٹائیگر کو دیکھیں۔"

"ابو جان آپ بھی اپنے موتی کو دیکھ لیں۔" دانیال بولا۔

دونوں چوہدری آگے بڑھے اور کھڑکی سے کمرے میں جھانکنے لگے۔ دونوں کے لیے اندر کا منظر ناقابلِ یقین تھا۔ ان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ موتی اور ٹائیگر ایک ہی برتن میں دودھ پی رہے تھے۔ لڑائی کے میدان میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دکھائی دینے والے کتے آپس میں لڑنے کی بجائے پیار و محبت سے اکٹھے دودھ پی رہے تھے۔ دونوں چوہدری سارا معاملہ سمجھ گئے تھے۔ ان کے بیٹے انھیں اس راستے پر لے آئے تھے جو صلح کی طرف جاتا تھا۔ موتی اور ٹائیگر کو اکٹھے دیکھ کر دونوں شرمندہ ہو رہے تھے کہ یہ حیوان ہو کر مل بیٹھے ہیں اور ہم انسان ہو کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ دونوں چوہدری ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور پھر ایک جھٹکے سے گلے لگ گئے۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا دانیال اور لیاقت کو شدت سے انتظار تھا۔ دونوں نے ملازمین کے ساتھ مل کر ایک ہفتہ کتوں کو اس ماحول میں رکھا تھا کہ وہ آپس میں شیر و شکر ہو گئے تھے۔ دونوں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ کامیاب بھی کیوں نہ ہوتے انھوں نے اس بات پر عمل کیا تھا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ الحجرات میں کیا ہے کہ "اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔" دونوں چوہدری جب بغل گیر ہوئے تو فضا محبت کی خوشبو سے معطر ہو گئی تھی۔ دونوں اپنے بیٹوں کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جنھوں نے انھیں کم عمر ہونے کے باوجود ایک بہترین سبق دیا تھا۔ یہ پہلا سبق تھا جو انھیں اپنے بیٹوں کی طرف سے ملا تھا۔ اس سبق کے بعد دونوں نے باہم فیصلہ کیا کہ وہ آپس میں محبت سے رہیں گے اور آئندہ کبھی گاؤں کے میلے میں کتوں کی لڑائی نہیں ہو گی۔

☆☆☆

تمنا پوری نہ ہوئی

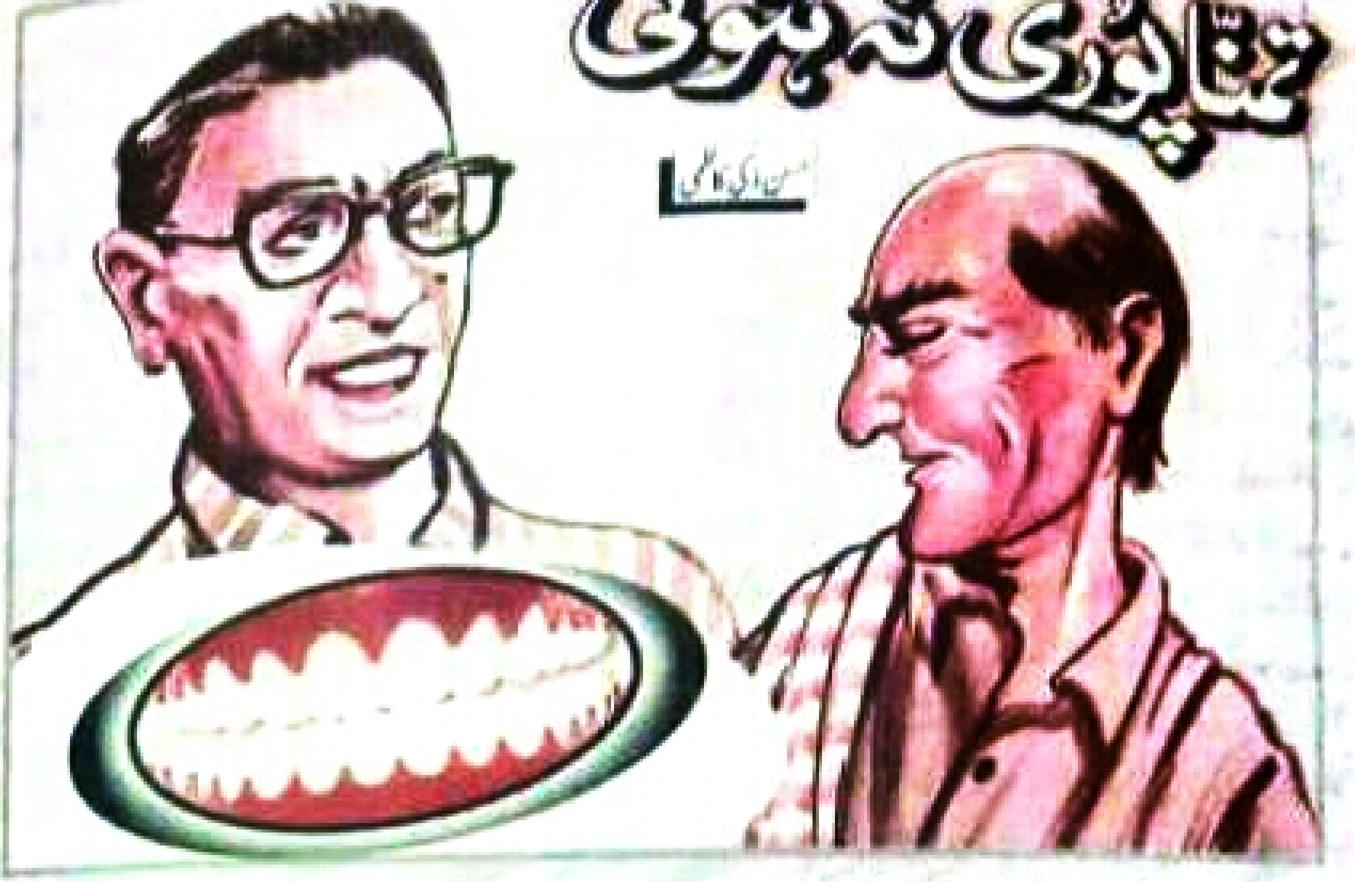

کریم نے فرش کی صفائی کرتے کرتے نظر اٹھا کر بیگ صاحب کو دیکھا۔ بیگ صاحب اخبار پڑھنے میں مصروف تھے اور چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے اخبار پر نظریں گاڑے ہوئے ہی جوشیلے انداز میں کہا "ونڈر فل" اور پھر اخبار ایک طرف رکھ کر آرام کرسی پر آدھے لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں جیسے کسی اہم بات پر غور کر رہے ہوں۔ بیگ صاحب کی صحبت میں اتنی انگریزی تو اب کریم کو بھی آ گئی تھی کہ وہ ونڈر فل، ویکسی لنٹ، ویری گڈ، ویری بیڈ اور اسٹوپڈ جیسے الفاظ کے نہ صرف معنی سمجھ لے بلکہ ان سے یہ اندازہ بھی لگا لے کہ بیگ صاحب کا موڈ کیسا ہے؟ اس وقت اس نے ان کے منھ سے ونڈر فل سنا اور چہرے پر مسکراہٹ بھری دیکھی تو اپنی پرانی خواہش کا ایک بار پھر اظہار کر دیا۔

"میاں جی۔ وہ اپنی بات آپ کو یاد دلانی ہے۔"

بیگ صاحب نے آدھی آنکھیں کھولیں اور کریم کو دیکھتے دیکھتے ان کی مسکراہٹ اتنی بڑھی کہ آنکھیں کھل گئیں۔

کریم نے سوچا کہ بہترین موقع ہے۔ اس نے فوراً تپتے لوہے پر چوٹ ماری۔ "میاں جی وہ میرے دانتوں کے چوکے کا کچھ کر دیں۔ ایمان سے نہ کھانے کا مزا ہے اور نہ ٹھیک سے بولا جاتا ہے۔ پھر پوپلا منھ بہت برا لگتا ہے کہ ایمان سے میں نے تو شیشہ دیکھنا چھوڑ دیا۔ دیکھیں آپ کا پورا دانت لگنے کے بعد کیسا جوان جوان لگتا ہے ماشاء اللہ۔"

کریم نے جس انداز سے ماشاء اللہ کہا اس پر تو بیگ صاحب کو ہنسی آئی لیکن جوان جوان لگنے کی بات پر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے اور کہنے لگے۔

"ارے کریم! فکر نہ کرو، بس اب تھوڑے ہی دن کی بات ہے۔ تمھیں ایسی بتیسی بنوا کر دوں گا کہ تیرا دل خوش ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر بیگ صاحب نے پھر اخبار اٹھایا اور سیدھے پلٹ کر کسی خبر پر نظریں جما دیں۔ اس بار وہ مسکراہٹ ایسی پھیلی کہ ہونٹوں کے دونوں کونے کانوں کی لوؤں کو چھونے لگے۔ کچھ دیر بعد بیگ صاحب اٹھے اور میز کی دراز میں سے قینچی نکال کر اخبار سے وہ خبر کاٹی اور اسے احتیاط سے یہ کہتے ہوئے رائٹنگ پیڈ میں رکھ دیا "اب رات کو اطمینان سے پڑھوں گا۔"

کریم نے اپنا کام ختم کر کے کن انکھیوں سے بیگ صاحب

کو دیکھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ بیگ صاحب کی بیوی وہی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ ان کے قریب جا کر کریم نے کہا "امی جان! ابھی چائے پی رہی تھیں۔ وہ بہت ہی خوش ہیں۔ مجھے جانا ہے جی۔"

"ابھی تو یہاں ہی بیٹھے تھے" بیگم نے کریم سے کہا لیکن وہ چار منٹ میں لاؤنج سے ہو کر بیگ صاحب کے کمرے میں پہنچیں۔ بہو کے سلام کا جواب دینے کے بعد بیگ صاحب خوش ہو کر بولے سو بھی خالص۔ "اچھا ہوا تم آ گئیں۔ بیٹی ایک چھوٹا سا کام ہے۔ تم جب بازار جاؤ تو..." یہ کہہ کر بیگ صاحب الماری کے پاس گئے۔ اسے کھولا اور پانچ سو روپے کا ایک نوٹ بہو کو تھماتے ہوئے بات وہیں سے شروع کی "میرے لئے ایک کالنگ کارڈ لیتی آنا۔"

بہو نے ذرا حیران ہو کر پوچھا "ابا! آپ پانچ سو روپے کے کارڈ کا کیا کریں گے؟ آج کل تو سو روپے کے کارڈ میں بڑی دیر تک بات..."

بیگ صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اچھا تم تو وکیلوں کی طرح جرح شروع کر دیتی ہو۔ ارے بیٹی کچھ سوچ سمجھ کر ہی پانچ سو کا کارڈ منگوا رہا ہوں۔ وہ لندن راشد کو فون کرنا ہے۔ لمبی بات ہو جاتی ہے۔ خالی خیر و عافیت ہی تھوڑا دریافت کرنا ہوتی ہے۔ ارے بیس سال کی دوستی ہے۔ ہر سال کا ایک منٹ بھی رکھو تو تو بیس منٹ تو بات ہونا ہی چاہیے۔" یہ کہہ کر بیگ صاحب اپنے تئیں بہت زبردست جملہ کہہ دیا ہو۔ بہو نے مسکراتے ہوئے کہا "میں سمجھ گئی۔ راشد انکل پاکستان آنے والے ہیں نا... اب آپ بیس منٹ میں ان سے بیس چیزیں لانے کی فرمائش کریں گے۔"

بیگ صاحب اب ہوا میں آ چکے تھے۔ انہوں نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے "کہ بیس چیزیں منگواؤں گا تو ان میں سے پچاس تمہاری، تمہارے بچوں کی اور تمہاری ساس کی ہوں گی۔ لیکن سنو۔ اس بار مجھے صرف ایک چیز کی فرمائش کرنا ہے۔ پر وہ چیز ہے زبردست..."

یہ کہہ کر بیگ صاحب نے میز پر رکھا ہوا ایک پیڈ اٹھایا اور دراز میں بند کر دیا جیسے ڈر رہے ہوں کہ بہو اس کے بیچ میں رکھا ہوا اخبار کا تراشہ نہ دیکھ لے۔

رات کو بڑی دیر تک دونوں دوستوں میں ٹیلی فون پر بات ہوتی رہی۔ گفتگو کے آخری جملے یہ تھے۔

"کہہ کر تو دیکھتا آؤں گا۔ ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ آخر منگوا کس کے لئے رہے ہو؟"

"یار وہ دفتر کے ایک پرانے ساتھی ہیں۔ بڑے شریف انسان ہیں۔ ان کا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ اسے اپنے کلینک کے لئے چاہیے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ بھئی آپ لندن جاتے رہتے ہیں ہمارا یہ کام کر دیں۔ میں نے بتایا کہ میں تو اس سال نہیں جا رہا لیکن میرے ایک عزیز دوست آنے والے ہیں۔ وہ یہ کام کر دیں گے۔ بس اس دن سے وہ پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ دیکھو یار مجھے ان سے شرمندہ مت کرانا۔ اور ہاں... پیسوں کی بالکل فکر نہ کرنا۔ پہنچتے ہی آ کے اس کی قیمت تمہیں مل جائے گی۔ ساری تفصیل نوٹ کر لی ہے نا؟"

"ہاں ہاں یار سب نوٹ کر لیا۔ تم اس کی قیمت بھی دے دینا لیکن اس وقت میری جان چھوڑ دو۔"

بیگ صاحب نے ٹیلی فون بند کر کے زور کی انگڑائی لی اور بستر پر لیٹ گئے۔

راشد سے ملاقات اور ساتھ وقت گزارنے کی خواہش تو بیگ صاحب کے دل میں ہمیشہ رہتی تھی۔ لیکن اس بار یہ کچھ زیادہ ہی تھی۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ گن گن کر گزر رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ دن آ ہی گیا کہ راشد صاحب لاہور پہنچے۔ ایئرپورٹ سے گھر تک راستے میں بہت سی باتیں ہوئیں لیکن راشد نے اس چیز کا ذکر نہ کیا جو بیگ صاحب نے منگوائی تھی۔ گھر پہنچ کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں لیکن پھر بھی راشد نے کچھ نہ کہا۔ آخر بیگ صاحب سے صبر نہ ہوا، پوچھ ہی لیا۔ "یار وہ ہماری چیز بھی لائے ہو؟"

راشد مسکرا کر بولے "تمہارے سے بھلا لایا ہوں۔ ذرا دم تو لینے دو۔ سامان کھولوں گا تو دے دوں گا۔ لیکن یار وہ تمہارے ڈاکٹر صاحب بالکل گھامڑ ہیں۔ انہیں یہ بھی نہیں پتہ کہ یہ آلہ یہاں پاکستان میں بھی مل سکتا ہے۔ یہ 2004ء میں ایجاد ہوا تھا اور اب دو سال بعد یعنی 2006ء میں یہ بہت سے ملکوں میں دستیاب ہے۔ بہرحال تمہاری فرمائش پوری کرنے کے لیے میں وہاں سے لے کر آیا ہوں اور یہاں ایجنسی کا پتہ بھی لے آیا ہوں۔ تاکہ اگر کوئی خرابی ہو یا کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو ان سے رابطہ کر لیا جائے۔"

بیگ صاحب نے حیران ہو کر کہا "لیکن یہ تم نے تو یہ خبر ابھی نہیں سنائی پہلے بڑی بھی۔"

راشد بولے "یہ تو نہیں معلوم۔ شاید پہلی آئی ہو اور ٹیکنالوجی میں دو سال لگ گئے ہوں۔ لیکن تم نے خبر کہاں پڑھی؟ تم تو کہہ رہے تھے کسی ڈاکٹر نے منگوایا ہے۔"

بیگ صاحب بوکھلا گئے۔ پھر سنبھل کر بولے "ہاں ہاں بھئی وہ اخبار کا تراشہ مجھے دکھانے لایا تھا۔ میں تمھیں دکھاتا ہوں۔ میں نے وہ سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر بیگ صاحب اپنے کمرے میں گئے اور وہاں سے لا کر تراشہ راشد کو تھما دیا۔ راشد نے جلدی جلدی پڑھ کر کہا:

"یہ لکھا ہے کہ اس ایجاد ہونے کے بعد دو سال تک اس پر تجربے ہوتے رہے اور تجربوں کی کامیابی کے بعد اب یہ کئی ملکوں کی مارکیٹ میں آگیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کوئی کام کی بات کرو۔"

راشد چند روز اسی خوشی لاہور میں گزار کر اسلام آباد روانہ ہوئے اور ادھر بیگ صاحب نے کئی دن تک اس پمفلٹ کا بڑے غور سے مطالعہ کیا جس میں اسے استعمال کرنے کی ہدایتیں درج تھیں۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد آخر اللہ کا نام لے کر انھوں نے اس کا استعمال شروع کرنے کی ٹھان لی۔ آلے کے استعمال کو انھوں نے پوشیدہ رکھا البتہ اسے استعمال کرنے سے پہلے سارے گھر میں یہ اعلان کر دیا کہ نقلی دانتوں کی بتیسی میں کسی خرابی کی وجہ سے وہ کچھ دن تک اسے استعمال نہیں کریں گے کیونکہ اس کی وجہ سے ان کے تالو میں زخم بن گیا ہے۔ زخم ٹھیک ہونے تک وہ بغیر بتیسی کے کام چلائیں گے لہٰذا ناشتے میں انھیں دلیہ دیا جائے، دوپہر کو پتلی کھچڑی اور رات کو شوربے میں ڈوبی ہوئی روٹی یا اسی قسم کی کوئی اور چیز۔ اس عرصے میں وہ بات چیت بھی کم کریں گے کیونکہ پوپلے منہ سے بولنا انھیں اچھا نہیں لگتا۔ اس اعلان سے سب گھر والوں کو پریشانی ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے بڑی ہمدردی سے بیگ صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھائیں۔ کہیں زخم بڑھ نہ جائے۔ لیکن ہمدردی جتاتے جتاتے ان سے رہا نہ گیا۔ آخر میں مسکرا کر یہ جملہ بھی جڑ دیا "چلو زخم کے بہانے کچھ دن تو منہ بند رہے گا۔ ذرا سکون رہے گا گھر میں۔"

بیگم کی مسکراہٹ قائم رہی۔ آہستہ سے بولیں۔ "ارے بیگ صاحب! دو چار دن دلیہ اور کھچڑی کھا لیں تو زخم خود بخود بھر جائے گا۔"

بیگ صاحب جھلا کر کچھ کہنے والے تھے کہ بہو بیچ میں آ گئی "ابا چھوڑیے یہ باتیں۔ میں شام کو آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گی۔ وہ کوئی مرہم یا کریم دے دیں گے لگانے کو۔"

"نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں اپنا علاج خود کر لوں گا۔ چند دن میں زخم ٹھیک ہو جائے گا۔"

بیگم نے بیگ صاحب کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے ہمدردی جتائی۔ "نہیں خواہ مخواہ میں تکلیف بڑھ جائے گی۔ بہو تم انھیں زبردستی لے جانا۔"

بیگ صاحب کا مزاج بگڑ چکا تھا۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولے "ہونہہ۔ میں دو سال کا بچہ ہوں۔ زبردستی لے جاؤ۔"

بیگ صاحب کو دلیہ اور کھچڑی کھاتے کھاتے چار پانچ دن گزر گئے۔ ایک دن کریم کمرے کی صفائی کے دوران بولا "میاں جی یہ دانتوں کے چوکے کے بغیر تو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی آپ کو؟"

بیگ صاحب موڈ میں تھے "ارے بس اب دو ہفتے کی بات اور ہے۔ اور اب ان نقلی دانتوں کی مجھے ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ تو میرے لیے بیکار ہیں۔"

بیگ صاحب کی اس بات پر کریم نے آنکھیں پھاڑ کر ان کی طرف دیکھا اور حیران ہو کر بولا "میاں جی وہ کیسے؟"

بیگ صاحب بے پروائی سے بولے "ارے دیکھتے جاؤ کریم، بس ایک معجزہ ہونے والا ہے۔"

کریم نے معجزے والی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ بڑی لجاجت سے بولا "میاں جی آپ کو یہ نقلی بتیسی استعمال نہیں کرنا تو مجھے ہی دے دیں۔ غریب کا بھلا ہو جائے گا۔"

بیگ صاحب نے پوچھا "کیا کرو گے اس کا؟"

کریم بیگ صاحب کے قریب آ کر بولا "میاں جی وہ بہو جی بتیسی تو اللہ جانے کب بنے گی۔ میں نے سوچا اسی سے کام چلا لوں۔ خالی پوپلے منہ سے تو بہتر ہے۔"

بیگ صاحب کو ہنسی آ گئی۔ کہنے لگے "ارے پاگل ہوا ہے

"کوئی فرق تھوڑی ہے کہ ایک کی بتیسی دوسرے کے لگ جائے۔ ہر ایک منہ کی اپنی ناپ ہوتی ہے۔"

کریم کے پاس جواب تیار تھا "میاں جی آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے پڑوس میں جو انور دندان ساز ہے جی۔ وہ بڑا کاریگر ہے۔ وہ آپ کا جبڑا گھس گھسا کر ٹھیک کرے گا اور میرے منہ میں فٹ کر دے گا۔"

بیگ صاحب نے اسے ٹالنے کو کہا "اچھا دے دوں گا۔ تھوڑے دن صبر کرو۔"

بیگ صاحب کو پتلی کھچڑی کھاتے چھ ہفتے ہونے کو آئے اور اب ان کی حالت بھی پتلی ہو گئی۔ لیکن دل کی آرزو پوری ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ ادھر سارے گھر والے سخت پریشان تھے کہ آخر کیسا زخم ہے جو بھرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ سب کو یہ بھی حیرانی تھی کہ بیگ صاحب ڈیڑھ مہینہ گزر جانے کے بعد بھی اس ضد پر اڑے ہوئے ہیں کہ ڈاکٹر کو نہیں دکھائیں گے۔ اور ظاہر میں ایسا لگتا تھا کہ انھیں کوئی تکلیف بھی نہیں ہے۔

خیر دلیہ کھچڑی اور شوربے میں ڈوبی روٹی جب حلق سے اترنا ممکن نہ رہا تو بیگ صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ اب کچھ نہ کچھ کارروائی کرنا چاہیے۔ گھر والوں سے ہر بات راز میں رکھی تھی لہٰذا ان سے کیا بات کرتے۔ آخر کچھ سوچ کر اس ایجنسی کا پتہ اور فون نمبر تلاش کیا جو پاکستان میں وہ آلہ درآمد کر رہی تھی پھر انھیں فون کر کے بتایا کہ یہ آلہ انھوں نے لندن سے منگوایا تھا لیکن یہ ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ ڈیڑھ مہینے میں کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ جواب ملا "نتیجے کے لیے تین مہینے انتظار کیجیے۔"

بیگ صاحب نے جلے کٹے لہجے میں کہا:

"بھائی ٹھیک ہے۔ لیکن ڈیڑھ مہینے میں کچھ تو اثر ہوتا۔ کچھ تو نظر آتا۔" جواب ملا "زحمت کر کے آلہ ہمارے پاس لے آیئے۔ چیک کر لیں گے۔"

بیگ صاحب ایجنسی کے دفتر پہنچے تو پہلا سوال یہ کیا گیا "آپ بچے کو ساتھ نہیں لائے؟"

بیگ صاحب بوکھلا گئے۔ "کیا بچہ؟ کس کا بچہ؟"

جواب ملا "چلیے بچہ نہ سہی۔ جو بھی مریض ہے اسے ساتھ لے آتے تو ہمارے ماہر اس کا معائنہ کر لیتے۔"

بیگ صاحب ناراض ہو گئے "آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ ارے بھائی میں خود مریض ۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ میں خود اسے اپنے دانت اگانے کے لیے یہ آلہ پچھلے چھ سات ہفتے سے استعمال کر رہا ہوں۔ اور کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک دانت نہیں نکلا کم بخت۔ بالکل بیکار ہے۔ پیسے ضائع ہو گئے میرے۔"

جس شخص سے بات ہو رہی تھی اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا اور دوسری طرف دیکھنے لگا لیکن اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ اس نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا:

"اس مشین سے آپ ۔۔۔ ہی ہی ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ آپ اپنے ۔۔۔ ہی ہی ہی

بھی اپنے دانت اگا رہے تھے؟ اور یہ بھی پوری بتیسی؟ ---- ہی ہی ہی۔"

بیگ صاحب کا دل چاہا کہ دھاڑ کر اس سیلز مین کی پوری بتیسی باہر نکال دیں لیکن غصے پر قابو پاتے ہوئے بولے۔
"میں یہاں میرے دانت اگانے پر آپ کی کمپنی نے کوئی پابندی لگائی ہے؟"

سیلز مین نے بھی تو دیا ہوا تھا۔ سنجیدگی سے بولا "میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن میرے بزرگ آپ یہ تو پڑھ لیجیے اس پمفلٹ میں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ یہ آٹا جو سالوں میں اگنے والے گندم کے دانوں سے آتا ہے اور الٹرا ساؤنڈ پیدا کرتا ہے منہ میں دانتوں یا مسوڑوں میں پیوست کر دیا جاتا ہے۔ اسے دن میں تین مرتبہ استعمال کر لیا جائے تو کافی ہے اور یہ علاج بارہ دن تک جاری رہنا چاہیے۔ اس آٹے کو چبا دیا جائے تو اس سے پیدا ہونے والی الٹرا ساؤنڈ لہریں ٹوٹے ہوئے دانت کے مسوڑوں کی اس طرح مالش کرتی ہیں کہ ان میں خون کا بہاؤ بڑھ جاتا ہے اور دانت بننے والے سے نشوونما پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس آٹے میں ایک ایسا بری پروگرام چپ ہوتا ہے جو روزانہ دانت چبانے اور بند کرتا ہے اور مریض کو اس کا کوئی خاص احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے مسوڑوں کی مالش ہو رہی ہے۔

کینیڈا کی البرٹا یونیورسٹی میں ٹوٹے ہوئے دانت کی جگہ نیا دانت اگانے کی یہ تحقیق پہلے خرگوش اور پھر انسانوں پر کی گئی اور کامیاب رہی۔"

بیگ صاحب نے جھلا کر کہا "میاں صاحب زادے! میں یہ سب کچھ پڑھ چکا ہوں۔ کیوں اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ یہ کہہ کر ---- "ایک مرتبہ پھر سیلز مین پر ہنسی کا دورہ پڑا اور اس نے بات پوری کی "میرے بزرگ ---- ہی ہی ہی ---- یہ تو بچوں کے ایک دو دانت اگانے کے لئے ہے۔ جن کی جڑیں ابھی زندہ ہوں۔ ہا ہا ہا ---- نہ کہ بوڑھوں کی پوری بتیسی اگانے کے لئے ---- ہی ہی ہی۔"

بیگ صاحب چھڑی کے سہارے تیزی سے اٹھے اور لاحول پڑھتے ہوئے ایجنسی کے دفتر سے باہر آ گئے۔ گھر پہنچ کر محلے کی دوڑ میں بتیسی تلاش کرنے لگے۔ اچانک خیال آیا کہ وہ تو کریم کو دے دی تھی۔ جیسے ہی کریم آیا بیگ صاحب نے سوال کیا "کریمو وہ بتیسی کیا ہوئی؟"

کریم نے قریب آتے ہوئے کہا "میاں جی! وہ تو دندان ساز کو دی تھی کہ اسے میرے منہ میں فٹ کر دے۔ کم بخت نے اسے گھس گھس کر آدھا کر دیا لیکن کچھ کام نہ بنا۔ میاں جی! اب آپ ہی میرے لئے تو بس نئی بتیسی لگوا دیں۔ بڑی مہربانی ہو گی۔"

بیگ صاحب نے آگ بگولہ ہو کر کمپنی کا سارا غصہ کریم پر نکالا "دفع ہو جا بھاگ یہاں سے ---- اتنی قیمتی مشین بے کار گئی۔ اس منحوس دندان ساز نے میری بتیسی کا ستیاناس مار دیا اور اب تو کہہ رہا ہے کہ تجھے نئی بتیسی لگوا دوں۔ کل کہے گا میرے منہ میں سونے کے دانت لگوا دیں۔ کم بخت کو اتنی جلدی تھی میری بتیسی لینے کی خود بھی پوپلا رہا اور مجھے بھی پریشان کر دیا۔"

بیگ صاحب کریم پر برس رہے تھے کہ کھڑکی میں سے دو بچوں کے ہنسنے کی آواز آئی اور پھر ایک بچے نے زور سے کہا "دادا جان! وہ آٹا ہمیں دے دیں۔ ہم دونوں ڈاکٹر ڈاکٹر کھیلیں گے اور اپنے دوستوں کے دانت اگائیں گے۔ ہا ہا ہا ---- ہی ہی ہی ----"

بیگ صاحب نے غصے میں زور سے کھڑکی بند کی اور بڑبڑائے "اللہ اس نئی نسل سے محفوظ رکھے۔"

کچھ دیر بعد بیگ صاحب بستر پر لیٹ گئے اور اپنے منصوبے کی ناکامی پر غور کرنے لگے۔ اچانک خیال آیا "او رمضان ختم ہونے کو ہے اور عید میں ہفتہ بھر باقی ہے۔ اتنی جلدی تو نئی بتیسی بن نہ سکے گی۔ نہ تو عید پر کھانے پینے کا مزا آئے گا اور نہ پوپلے منہ سے بولتے ہوئے اچھا لگے گا۔ اب کیا کریں؟"

بیگم کمرے میں آئیں تو بیگ صاحب نے دل کڑا کر کے ان سے سارا ماجرا بیان کیا لیکن ہمدردی کے بجائے بیگم نے قہقہے لگائے اور بولیں۔

"کوئی بات نہیں۔ یہ تو سویوں والی عید ہے۔ بقر عید تھوڑا ہی ہے۔ سویوں کا مزا تو پوپلے منہ میں زیادہ آئے گا۔ دیسے وہ بھی دودھ سے تو زیادہ ہی نرم ہوں گی ---- ہا ہا ہا۔"

☆☆☆

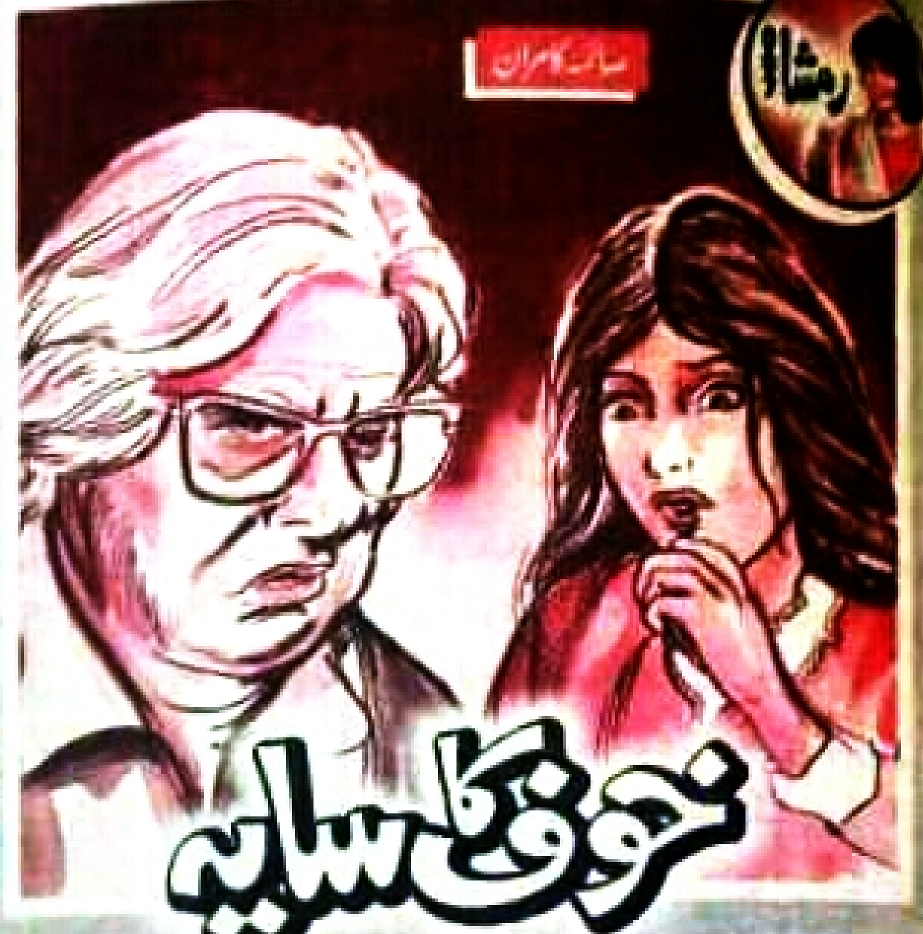

خوف کا سایہ

صائمہ کامران

فلاور پارٹمنٹس کے نیچے لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔۔۔ پولیس کی جیپ اور ایمبولینس پہنچ چکی تھی۔ پولیس کے جوانوں کے بھاری بھاری بوٹوں کی دھمک سے جیسے ایک پل کو سناٹا چھا گیا۔ لوگ سہم سہم کر ایک طرف ہٹنے لگے۔ پولیس فلیٹ نمبر 14 میں داخل ہوئی۔ یہ ایک لگژری اپارٹمنٹ تھا۔ ایک ایک چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔۔۔ اور اس شاندار فلیٹ کی مالکہ بے حس و حرکت قالین پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ کسی نے ان کے سر پر عقب سے وار کیا تھا اور بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی تھیں۔ ان کا نام بیگم یاسمین اور عمر 60 سال کے لگ بھگ تھی۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک رہنے والی بیگم یاسمین کو شاید کم ہی لوگوں نے غصے میں دیکھا ہو گا لیکن سنا ہے کہ جب بھی وہ غصے میں آ جاتی تھیں تو ان کو قابو کرنا بڑا مشکل ہو جاتا تھا لیکن ایسے مرحلے شاذ و نادر ہی آتے تھے۔

گزشتہ صبح ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ اپنے اکلوتے چار سالہ پوتے مانی کو اسکول چھوڑنے گئیں۔ مانی کے والدین کا انتقال پچھلے سال ایک کار ایکسیڈنٹ میں ہو گیا تھا۔ بیگم یاسمین تبھی سے مانی کو اپنے کلیجے سے لگائے پھرتی تھیں۔ اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر ایسے تلملا اٹھتی تھیں جیسے اگر انہوں نے بروقت مانی کی تکلیف دور نہ کی تو قیامت آ جائے گی۔ اس دن اسکول میں مانی کی ٹیچر نے کسی بات پر اس کی تھوڑی بہت سرزنش کر دی تھی۔ یہ بات بیگم یاسمین کو کہاں ہضم ہوتی۔ انہوں نے جیسے ہی ٹیچر کی تیوری پر بل دیکھے تو وہ جیسے آپے سے باہر ہو گئیں۔ انہوں نے قریب رکھا گلدان اٹھا کر ٹیچر کے سر پہ دے مارا۔ ٹیچر بے چاری تو خوف زدہ ہو کر بھاگی۔ آس پاس کے لوگوں نے بیگم یاسمین کو قابو کیا۔ لیکن وہ کہاں کسی کی سنتی تھیں۔ اس عمر میں بھی ان کے ہاتھ پاؤں خاصے مضبوط تھے۔ آخر پرنسپل صاحب موقع پر پہنچ گئے اور معاملے کو رفع دفع کر دیا اور بیگم یاسمین کے اس رویے کو ان کی ضعیف العمر دیوانگی سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن مانی کی ٹیچر کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ خوف اور نفرت کے ملے جلے جذبات سے بیگم یاسمین کو دور اسٹاف روم میں کھڑی گھور رہی تھی۔ اسکول میں موجود ڈاکٹر ٹیچر کے زخم کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد بیگم یاسمین جب اپنی اضطراری حالت سے باہر آئیں تو بڑی نادم ہوئیں۔ اسی وقت نجانے بازار سے کتنے پھول اور پھل لے کر ٹیچر کے پاس اسٹاف روم میں پہنچیں، لیکن تب تک ٹیچر گھر جا چکی تھی۔ بیگم یاسمین نے اسکول کے چپڑاسی کو پیسے دے کر ہدایت کی کہ یہ سامان مذکورہ ٹیچر تک پہنچا دے اور وہ کل خود اس سے معافی مانگیں گی اور اس کی خیریت بھی دریافت کریں گی۔ لیکن کل کس نے دیکھی۔ آج صبح نو بجے کام والی نے جیسے ہی فلیٹ کا

دروازہ دھڑ دھڑایا تو دروازہ اپنے آپ ہی کھل گیا اور سامنے بیڈ روم کے اوپر بیگم یاسمین مُردہ حالت میں پڑی تھیں۔ اس دن چھٹی تھی اس لیے ان کا پوتا بلال دوسرے کمرے میں موجود تھا۔ لیکن وہ اس قدر سہما ہوا تھا کہ کوئی لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں نکل رہا تھا۔ پولیس نے تمام کارروائی جلدی جلدی مکمل کی کیونکہ انسپکٹر خورشید نہیں چاہتے تھے کہ بلال اور زیادہ ہراساں ہو۔ فلیٹ کے اردگرد رہنے والوں کو گزشتہ روز کے اسکول کے واقعے کا علم تھا۔ بیگم یاسمین نے ہی پولیس آ کر بتایا تھا وہاں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی اپنے ہمسایوں کو شریک کرتی تھیں۔ اس لیے پولیس کا پہلا شک ٹیچر ارم پر ہی گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی پولیس کی گاڑی ٹیچر ارم کے دروازے پر کھڑی تھی اور ٹیچر ارم سر پر پلو باندھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے لیڈی پولیس کو دیکھ رہی تھیں جو ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"رمشاء..... میری امی ایسا ہرگز نہیں کر سکتیں۔ تم تو جانتی ہو نا۔" ٹیچر ارم کی بیٹی صدف روہانسی آواز میں فون پر رمشاء کو اس صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔ صدف کے ابو سعودی عرب میں رہتے تھے اور ابھی ایک ماہ ہی ہوا چھٹیاں گزار کر دیار غیر روانہ ہوئے تھے۔ گھر میں صدف کی بوڑھی دادی اور امی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ پولیس کے پاس ان کے خلاف جو تھوڑے بہت شواہد تھے وہ یہ تھے کہ صبح سات بجے ٹیچر ارم قریبی میڈیکل سٹور سے دوا لانے کے لیے نکلی تھیں اور کوئی دو تین گھنٹے بعد واپس آئی تھیں۔ وہ گھنٹے کہاں رہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق میڈیکل سٹور بند تھا اس لیے وہ اس میں سوار ہو کر ہسپتال پہنچیں تاکہ وہاں کے میڈیکل سٹور سے دوا لے سکیں۔ ساری رات ان کو سر کی تکلیف نے سونے نہیں دیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھیں کہ جلد سے جلد دوا لے کر چھٹی کے دن کچھ دیر آرام کر لیں لیکن بدقسمتی سے ہسپتال کے میڈیکل سٹور میں بھی مذکورہ دوائی نہ مل سکی۔ جو اسکول کے ڈاکٹر نے ان کو ہدایت کی تھی اور یوں وہ مایوس ہو کر گھر واپس آئی ہی تھیں کہ پولیس نے پوچھ گچھ کے لیے حراست میں لے لیا تھا۔

"میں تمہاری امی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت صابر اور بلند اخلاق کی مالک ہیں۔ وہ ایسے بھیانک جرم کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم فکر نہ کرو، میں ابھی تمہاری طرف آتی ہوں۔"

رمشاء نے صدف کو فون پر تسلی دی۔ وہ دونوں بچپن سے ایک ساتھ ایک ہی کلاس میں پڑھی تھیں۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کو بلکہ ایک دوسرے کے گھر والوں کو بھی اچھی طرح جانتی تھیں۔ رمشاء کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ آنٹی ارم ایسا نہیں کر سکتیں لیکن حالات کچھ عجیب سے نظر آ رہے تھے۔ اس نے امی کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور ان کی اجازت سے ابو کے ساتھ آنٹی ارم کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

صدف نے رو رو کر اپنا حال برا کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے بات ہی ایسی تھی، اس کے تو ابو بھی بیرون ملک تھے اور ادھر لوگ پولیس کو دیکھ لیں تو تماشا دیکھنے کے لیے تو ضرور کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن آگے بڑھ کر ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا اور ایسی ہی ستم ظریفی کا شکار اس وقت صدف اور اس کے گھر والے نظر آ رہے تھے۔ رمشاء جو کچھ صدف سے معلوم کر سکی تھی اس نے کرنے کی کوشش کی لیکن حالات کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھے۔ آنٹی ارم اگرچہ غصے مزاج کی خاتون ضرور تھیں لیکن بیگم یاسمین کی اس اچانک بے سروپا حرکت نے انہیں چڑچڑا کر رکھا تھا اور اس پر سردرد نے ان کو الگ ہلکان کیا ہوا تھا۔ لیکن اتنی صبح صبح دوائی کے لیے نکل جانا بھی کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ رمشاء نے وہیں سے انسپکٹر خورشید کو فون کیا اور تھانے آنے کی اجازت چاہی۔ آدھے گھنٹے بعد رمشاء انسپکٹر خورشید کے سامنے بیٹھی کیس کو اسٹڈی کر رہی تھی۔

"چونکنے والی بات یہ ہے کہ میڈم ارم نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔" انسپکٹر خورشید نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔" رمشاء نے الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"فلیٹ کے اردگرد کے لوگوں نے دیکھا کہ صبح کی سیر پر جانے والی بیگم یاسمین جب واپس آئیں تو ان کے ساتھ تیس پینتیس سالہ ایک خاتون بھی تھیں۔ جو کچھ دیر کے بعد ان کے فلیٹ سے نکلی اور نیچے آ کر رکشہ پکڑا اور جب ہم نے اس خاتون یعنی میڈم ارم سے اس بارے میں پوچھا تو وہ صاف مکر گئیں۔ یہ بات ہمارے شک کو تقویت دیتی ہے۔" انسپکٹر خورشید نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"کیا میں میڈم ارم سے مل سکتی ہوں — " رمشاء کی

فوراً ہوش میں بولا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" یہ کہتے ہی انسپکٹر خورشید نے اے ایس آئی کو ہدایت کی کہ وہ رمشاء کو میڈم ارم تک لے جائے۔

"آنٹی ارم آپ نے جھوٹ کیوں بولا آنٹی۔" رمشاء نے بلکتی ہوئی آنٹی ارم کے گلے لگتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے پاس چودہ دن سے بیٹھی تھی۔

"بس بیٹا میں گھبرا گئی تھی اور پھر عقل پر پتھر پڑتے کتنی دیر لگتی ہے۔ میں جب ہسپتال کے گیٹ کے اندر داخل ہونے ہی والی تھی کہ بیگم یاسمین ہاتھ میں تسبیح لیے جو گر پہنے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی واک کرتی نظر آئیں۔ مجھے کل کے واقعے پر شدید غصہ تھا اس لیے میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ لیکن وہ کمال محبت سے مجھ سے لپٹ گئیں اور معافیاں مانگنے لگیں۔ انہوں نے کچھ ایسے پیار سے مجھے گھیرا کہ میں واقعی چند لمحوں میں ہی اپنا سارا غصہ بھول گئی۔ انہوں نے کہا کہ جو دوائی مجھے چاہیے وہ ان کے فرسٹ ایڈ باکس میں ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے چائے کی دعوت بھی دے ڈالی اور اتنے اصرار سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکی۔ میں ان کے ساتھ ہی چل پڑی چند قدم کے فاصلے پر ان کا گھر تھا میں ان کے ساتھ چودہ میں مست رہی۔ وہ اپنے قیمتی نوادرات میں شامل مختلف ڈیکوریشن پیس مجھے دکھاتی رہیں۔ اس دوران میں نے چائے پی اور دوائی لے کر ان کے فلیٹ سے بہت سی خوبصورت یادیں لے کر نکل آئی۔ رکشہ لیا اور گھر پہنچی گھر میں ابھی سب سو رہے تھے، میں بھی لیٹ گئی ابھی آنکھ ہی لگی تھی کہ پولیس نے بدقسمتی بن کر دروازے پر دستک دے دی۔ اور اب میں تمہارے سامنے ہوں۔ میں نے تم سے ایک لفظ بھی غلط نہیں بولا۔ میں بالکل بے گناہ ہوں رمشاء بالکل بے گناہ..... میں نے تو آج تک چیونٹی بھی نہیں ماری۔ ایک جیتی جاگتی عورت کا قتل تو سوچ کر بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔" آنٹی ارم نے روتے روتے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں آنٹی مجھے تھوڑا وقت دیں۔ خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" رمشاء نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا لیکن اس کا دل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ لگ رہا ہے وہ انہی سوچوں میں غلطاں ایک دفعہ پھر انسپکٹر خورشید کے سامنے آ کر بیٹھ گئی اور مزید معلومات حاصل کرنے لگی۔

"بیگم یاسمین کا پوتا ہانی اس وقت کہاں ہے۔" رمشاء نے اچانک سوال کر ڈالا۔

"وہ اپنی ایک ہمسائی آنٹی کے پاس ہے۔ لگتا ہے بیگم یاسمین کا

ہی کوئی نہیں تو قریبی رشتے دار اس شہر میں نہیں رہتے بچے کے پاس رہ کر تو خطرے میں رہتے ہیں وہ ایک دو دن میں یہاں آ جائیں گے۔ پھر ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔" انسپکٹر خورشید نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بالی سے ملنا ہے۔" رمشاء کسی خیال کے پیش نظر ایک دم کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

"ضرور ملو، لیکن وہ بچہ اس قدر خوفزدہ ہے کہ وہ تمہاری بالکل بھی مدد نہیں کر سکتا۔ پھر بھی تم اپنی تسلی ضرور کرو۔ شام تک فنگر پرنٹس ماہرین کی رپورٹ بھی آ جائے گی۔ وہ گلدان جس سے بیگم پرنس کے سر پر وار کیا گیا ہے نہایت وزنی دھات کا تھا۔ جس کے ایک ہی وار نے ان کا کام تمام کر دیا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس پر پائے گئے انگلیوں کے نشانات ہی ہمیں اس قاتل تک لے جائیں گے۔" انسپکٹر خورشید نے کچھ ایسے یقین سے یہ بات کہی کہ جیسے انہیں پورا یقین ہو کہ اس پر آنٹی ارم کے ہی انگلیوں کے نشانات ہوں گے اور رمشاء جھنجھلا گئی۔

رمشاء دو دن سے مسلسل بالی کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔ یہ اس کی محبت اور محنت ہی تھی کہ بالی بہت جلد اس کے ساتھ بے تکلف ہو گیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ کسی کو بھی اپنے پاس نہیں آنے دے رہا تھا۔ جو بھی اس کے قریب آتا وہ "تو تو، تو تو" کہہ کر اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیتا۔ بالی دراصل پانی کے نلکے کو تو تو کہتا تھا۔ اس کا حلق خوف سے اتنا تنگ ہو جاتا تھا کہ بار بار اسے پیاس لگتی تھی۔ لیکن جیسے ہی کوئی پانی اس کی طرف لے کر بڑھتا وہ خوفزدہ ہو کر گلاس دور پھینک دیتا۔

"بالی ایک بات بتاؤ اس دن تمہاری ٹیچر جب تمہارے گھر آئیں تو تم نے ان سے بات کی تھی؟" رمشاء بالی کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ بالی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "تم نے پھر اور کس کو فلیٹ میں آتے دیکھا تھا۔ کیا مجھے نہیں بتاؤ گے۔" رمشاء نے پُرامید نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ بالی کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ خوف اور دہشت نے اس کا رنگ سفید کر دیا اور وہ گہری آواز میں بولا "تو تو ...... آنٹی تو تو آیا تھا" اور یہ کہتے ہوئے وہ رمشاء سے لپٹ گیا۔ رمشاء نے خوفزدہ بچے کو دیکھا اور محبت سے اسے گلے لگا لیا۔ لیکن اچانک وہ چونک اٹھی یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟؟ وہ اپنے آپ سے بولی اور فوراً ٹیلیفون کی طرف بڑھی اور انسپکٹر خورشید کا نمبر ملانے لگی۔

دو تین گھنٹوں بعد رمشاء بالی کو لے کر تھانے میں بیٹھی تھی۔ سامنے ایک لمبا چوڑا آدمی کھڑا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی لیکن چہرے پر کسی ندامت کے آثار نہیں تھے۔

"اچھا تو تم ہو وہ "تو تو"۔" انسپکٹر خورشید کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"تمہاری اس خاتون کے ساتھ کیا دشمنی تھی تم تو وہاں ان کے نلکے کے پائپ ٹھیک کرنے جاتے تھے۔ تمہاری تو اچھی خاصی علیک سلیک تھی مرحومہ سے پھر تم نے یہ گھناؤنا جرم کیوں کیا۔" انسپکٹر خورشید نے درشت لہجے میں کہا۔

"انسپکٹر جی ...... مجھے تو اس کاکے کا پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ مجھے کہاں سے دیکھ رہا ہے ورنہ آپ تو آج میری گرد کو بھی نہ پا سکتے۔ خیر جو قسمت کو منظور۔ میرا ابھی کوئی کام کر کے نہیں پچھتایا۔ اس دن جب اس کے گھر نلکے کا پائپ ٹھیک کرنے گیا تو اس نے میری مزدوری کے لئے پرس کھولا سامنے ہزار ہزار کے نوٹ دیکھ کر ایمان ڈول گیا۔ لاؤنج میں آ کر پاس رکھا گلدان اٹھا کر دے مارا اور پیسے اٹھا کر چلتا بنا۔ مجھے معلوم تھا چھٹی کا دن ہے اس لیے کوئی مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ میں گھر کے پچھواڑے ایمرجنسی کے لیے نکالی گئی سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ نہ کسی نے آتے دیکھا نہ جاتے انگلیوں کے نشانوں کا کیا تھا آپ کا تو دھیان بھی میری طرف نہ جاتا، پر رب دی ذات بڑی نرالی ہے۔ مچھر سے نمرود مروا دیا اور اس چھوٹے سے کاکے نے مجھے پکڑوا دیا۔ اب اور کیا پوچھو گے؟" تیرا ابھی بھی کسی فلمی ولن کی طرح سے مسکرا کر بولا۔

"تم جیسے لوگ ہی انسانیت کے نام پر دھبہ ہو ...... اگر میرا ذہن کام نہ کرتا تو تمہاری وجہ سے بالی کی تو زندگی برباد ہوتی ہی ہوتی میری سہیلی کا گھر بھی اجڑ جاتا۔" رمشاء نے نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

آنٹی ارم ...... اب آزاد تھیں اور صدف ان سے لپٹ کر ایسے رو رہی تھی جیسے صدیوں بعد ان سے ملی ہو۔

ختم شد

پروفیسر: (نوکر سے) "جاؤ ایک خالی رکشہ لے کر آؤ۔"
نوکر: بہت دیر کے بعد واپس آ کر کہنے لگا "صاحب کوئی رکشہ خالی نہیں ملا۔"
پروفیسر نے پوچھا: "وہ کیوں؟"
نوکر نے جواب دیا: "صاحب مسئلہ یہ ہے کہ ہر رکشے میں ایک آدمی ضرور بیٹھا ہوتا ہے۔"
(فاطمہ شفقت، ساہیوال)

استاد (طالب علم سے) "اگر سورج دن کے ساتھ رات کو بھی نکلے تو کیا ہوگا؟"
طالب علم: "سر! بہت مزہ ہوگا دن کے ساتھ رات کو بھی سکول لگے گا۔"
(نگار زہرہ، راولپنڈی)

ایک دوست: "میرے ابو میں بڑی خوبیاں ہیں۔ بہادر ایسے جیسے شیر، تندرست ایسے جیسے ہاتھی، اور آنکھیں عقاب کی طرح تیز ہیں۔"
دوسرا دوست: "اگر تمہارے ابو کو دیکھنا چاہیں تو کتنے کا ٹکٹ لینا ہوگا۔"
(عائشہ شفقت، ساہیوال)

ٹرین پوری رفتار سے جا رہی تھی کہ ایک بوڑھی عورت نے جلدی سے زنجیر کھینچ دی۔ گاڑی کھڑی ہو گئی تو گارڈ نے آ کر پوچھا کہ کیا وجہ ہے۔ بوڑھی عورت بولی: "بیٹا گاڑی آہستہ چلاؤ کہیں میری ٹوکری میں رکھے ہوئے انڈے نہ ٹوٹ جائیں۔"
(وحید احمد، لاہور)

گڈو میاں اپنی خالہ کے ہاں دعوت میں گئے۔ کھانا کھا چکے تو خالہ نے کہا: "بیٹا شرماؤ مت اور کھاؤ۔"
گڈو میاں بولے: "بس خالہ جان، منہ تک پیٹ بھر گیا ہے اب جگہ نہیں ہے۔"
خالہ بولیں: "اچھا تو یہ تھوڑے سے انگور جیب میں رکھ لو۔"
گڈو میاں بولے: "شکریہ، خالہ جان، جیبیں بھی منہ تک بھری ہوئی ہیں۔"
(سنبل اشرف، گوجرانوالہ)

ایک شخص سائن بورڈ بنوانے کے لیے پینٹر کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ سائن بورڈ پر یہ عبارت لکھو: "ضمیر الدین کتب فروش۔"
دوسرے دن وہ سائن بورڈ لینے گیا تو اس پر لکھا تھا: "کتب الدین ضمیر فروش۔"
(خالد آفریدی، ملتان)

ایک دوست (دوسرے دوست سے) "میرے ابو اپنے بچپن میں ہمیشہ ریاضی کے پیریڈ میں کلاس میں سب سے پہلے آیا کرتے تھے۔"
دوسرا دوست: "مگر تمہارے ابو تو تین سال برابر ریاضی میں فیل ہوتے رہے۔ پھر وہ پہلے کیوں آتے تھے۔"
پہلا دوست: "آخری بنچ پر بیٹھنے کے لیے۔"
(سرمد علی کاظمی، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

ایک کنجوس پروفیسر نے جیب سے روپیہ نکالتے ہوئے لڑکوں سے کہا: "میں اسے تیزاب سے بھرے گلاس میں ڈال رہا ہوں کیا یہ اس میں حل ہو جائے گا۔"
ایک لڑکا بولا: "بالکل نہیں۔"
پروفیسر: "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"
لڑکا: "اس لیے کہ اگر یہ تیزاب میں حل ہو جاتا تو آپ اسے ہرگز تیزاب میں نہ ڈالتے۔"
(محمد شہزان، اوکاڑہ)

کھوج لگائیے!

نذیر اور کبیر شکار کے لیے جنگل میں گئے۔ انہوں نے وہاں ایک خیمہ لگایا اور شام کو کھانا پکانے کے لیے ایک اسٹوو جلا لیا۔ اچانک نذیر کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ اس نے افراتفری میں باہر بھاگنا چاہا تو کبیر نے اسے دھکا دے کر گرا دیا اور خود باہر چلا گیا۔ بتائیں اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور کیا نذیر کی جان بچ گئی؟

اکتوبر 2006ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے!" کا صحیح حل: سلیم اور ارسلان نے ویڈیو کیسٹس توڑ کر ان کے فیتے بطور رسی استعمال کرتے ہوئے بوتل کو باندھا اور اسے کنویں میں لٹکا کر پانی حاصل کیا۔

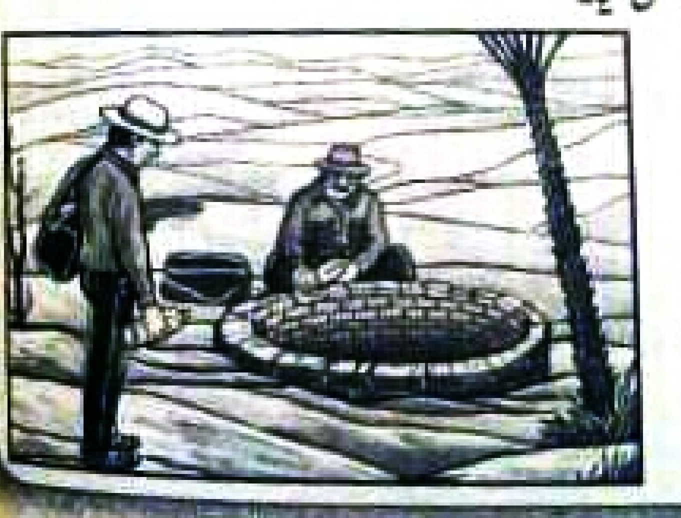

یہ جواب اس دفعہ بہت زیادہ بچوں نے ارسال کیا، جن میں سے 10 بچے بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار ٹھہرے۔ ان ساتھیوں کو 50'50 روپے کی کتابیں دی جا رہی ہیں۔

(1) محمد نعیم، راولپنڈی (2) رانا محمد عرفان، ملتان (3) تصور عباس، چکوال (4) سدرہ سلیم، کراچی (5) شاہین شاہد، لاہور (6) ثنا حمید، بہاول نگر (7) مدیحہ شفقت، ساہیوال (8) فریحہ پیرزادہ، واہ کینٹ (9) جواد ریاض، پشاور (10) ارسلان خان، نوشہرہ

صوفی نیاز مند اس وقت بال بنوانے میں مصروف تھے۔ عید کی آمد آمد تھی جس کے باعث صوفی صاحب کی تیاریاں بھی عروج پر تھیں۔ قینچی کے ساتھ ساتھ حجام کی زبان بھی چل رہی تھی۔ صوفی صاحب کو بال بنواتے وقت بات چیت کا کوئی خاص شوق نہ تھا لیکن وہ حجام کی زبان روکنے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ تین چار دکانیں انھوں نے محض اس لیے تبدیل کی تھیں کہ شاید کوئی تو ایسا ہو جو کم بولتا ہو لیکن اب تک ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی تھی۔ حجام کے نرخوں میں تو کمی بیشی انھیں نظر آئی لیکن بات چیت سے پرہیز کرنے والا کوئی شخص انھیں نہ مل سکا۔ وہ بہرحال مجبور تھے۔

"صوفی صاحب! آپ عید یہیں منائیں گے یا سسرال جائیں گے؟" اس نے ان کے سر پر پانی کا فوارہ چھوڑتے ہوئے سوال کیا۔

"ارے میاں! میں تو اپنے گھر پر ہی عید منانے کا قائل ہوں۔" صوفی صاحب نے گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

"آپ چاہے اپنے گھر پر عید منائیں مگر میں تو سسرال جاؤں گا۔" حجام نے ان کے بالوں کی لمبی لٹ پر تیزی سے قینچی چلاتے ہوئے کہا۔ "سسرال میں عید گزارنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔" خرچہ بھی کوئی نہیں، اور مال بھی مزے مزے کا۔" وہ اپنے حریص پن کا کھلا اظہار کر رہا تھا۔

"تم سسرال جاتے ہو تو جاؤ، مجھے کیا؟" انھوں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "میرے بال ٹھیک طرح کاٹو۔"

"صوفی صاحب! بال تو میں ایسے بناؤں گا کہ آپ آئینہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔" وہ اپنی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔

"دیکھ لیں گے۔" انھوں نے اپنی ناگواری برقرار رکھی۔

"صوفی صاحب! آپ کو معلوم ہے چینی کی قیمت کتنی اوپر جا رہی ہے۔" حجام نے ان کا خط بنانا شروع کرتے ہوئے موضوع بدلا۔

"ہاں بھئی! اس چینی کے ہاتھوں تو سب ہی پریشان ہیں۔" صوفی صاحب نے بھی اپنی پریشانی کا برملا اظہار کیا۔

"آپ کبھی یوٹیلٹی اسٹور گئے ہیں؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"گیا تو کبھی نہیں مگر اس کے باہر سے ضرور گزرا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"آپ نے حالت ابھی ہے ان استوروں کی" وہ ان کے
لگے ... تھا۔
"نہیں ... ہو گئے۔"
"آپ کو پتا ہے میں کتنی بار ان استوروں کے چکر لگا چکا
ہوں۔" وہ غصے سے بولا۔
"مجھے کیا معلوم ... تم کتنی بار ... آپ کی بار وہ ... لگاتے
ہوں گے۔"
"پورے 25 چکر لگا چکا ہوں صوفی صاحب" وہ کہتے
ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ "اور آپ کو حیرت ہو گی کہ
ان 25 چکروں کے بعد بھی میں ایک کلو چینی حاصل نہ کر سکا۔"
"مجھے تمہاری حالت پر افسوس ہے۔"
"آپ صرف افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔" اس کے لہجے
کے ساتھ نفرت ... ان استوروں سے پرچون
فروشوں کو شکر مل جاتی ہے صوفی صاحب۔" اس کا لہجہ مزید سخت
ہو گیا "میں ان کے خلاف کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"
"ارے میاں چھوڑو" صوفی صاحب نے اس کے ہاتھ کا
دوران کم کرنے کی کوشش کی۔ "تم شکر کے حصول کے لیے جو چاہو
کرو مگر میری انگلی تو مت کاٹو" وہ غصے سے بولے۔
"آپ نے خوب فکر کی صوفی صاحب" وہ جیسے ہوش میں
آتا ہوا بے پروائی سے بولا۔ "میرے پاس زخم بند کرنے کا پورا
بندوبست ہے خون ذرا نکل کر تو دیکھے۔"
"تو گویا تم زخمی کرنے کے موڈ میں ہو۔" انھوں نے درمیان
سے اٹھنے کی کوشش کی۔
"آپ تو یوں ہی ... خواہ مخواہ ... ناراض ہو رہے ہیں۔"
وہ ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ملائمت اختیار کرتے ہوئے بولا۔
"بس چھوڑو، مجھے جانے دو۔"
"یہ لیں میں نے اپنا منہ سی لیا اور آپ کا خط بنا دیا۔" اس
کے بعد حجام نے خاموشی اختیار کرنے میں عافیت جانی اور صوفی
صاحب کا باقی ماندہ کام نمٹانے لگا۔ وہ ان کی ناراضگی مول لے کر
ایک اور گاہک گم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔
"لیجیے صوفی صاحب! منہ کھولے بغیر آپ کا کام مکمل ہو گیا۔"
اس نے پشت سے انھیں آئینہ دکھاتے ہوئے کہا۔ انھوں نے
سکون کا سانس لیا اور کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
"25 روپے دے دیجیے صوفی صاحب" اس نے ہاتھ
ان سے پیسے طلب کیے۔
"کتنے ... کتنے ... کتنے ... یہ تو بہت زیادہ ہو گئے بھئی۔"
"عید کا سیزن ہے۔ تھوڑی نہیں دیں گے کیا صوفی
صاحب؟" اس نے بھاڑ سا منہ کھولا۔
"کمال ہے میاں! عید میں تو کافی دن ہیں، ابھی سے تم نے
تو..." وہ برے برے منہ بناتے ہوئے، رقم نکالنے لگے۔ دس دس
کے تین نوٹ انھوں نے حجام کے حوالے کیے۔ وہ واپس
باقی کا سکہ نکالنے لگا۔
"تمہارے ہاں حجامت کے کتنے پیسے ہیں؟" انھوں نے
اچانک سوال کیا۔
"10 روپے صوفی صاحب" وہ ان کی طرف پشت کیے
ہوئے بولا۔
"اور خط بنانے کے ...؟"
"صرف چھ روپے لیتا ہوں۔" وہ اپنے کم ریٹوں پر اتراتے
لہجے میں بولا۔
"ان دنوں عیدی کے کیا ریٹ ہیں تمہارے؟"
"صرف پانچ روپے کی کسر لے رہا ہوں صوفی صاحب" وہ باقی
کا سکہ انھیں تھماتے ہوئے بولا۔
"دس اور چھ سولہ" اور پانچ ... ارے میاں! تمہارے اپنے
حساب سے 21 روپے بن رہے ہیں پھر تم 25 روپے کیوں لے
رہے ہو؟"
"جی ایں ..." حجام اپنی بتائی ہوئی تفصیل میں الجھ چکا
تھا۔
"نہیں میاں یہ غلط بات ہے لاؤ نکالو چار روپے۔" انھوں
نے ہتھیلی آگے بڑھائی۔
"چھوڑیں صوفی صاحب! عید کا موقع ہے۔" وہ گڑگڑایا۔
"بھئی حساب ہوتا ہے وہ تو ہو چکا۔ اب جو بچا ہے وہ تو
تمہیں دینا ہی پڑے گا۔"
وہ آئیں بائیں شائیں کرتا رہا لیکن وہ صوفی صاحب ہی
کیا جو کسی کی بات مان لیں۔ وہ اپنے چار روپے اس سے نکلوا کر

ی رہے۔

توہم صوفی صاحب کی کنجوسی پر دل ہی دل میں تبصرہ کر رہ گیا۔ اسے ان سے ایسی امید نہ تھی۔ وہ کافی دیر تک اس بات پر پچھتاتا رہا کہ اس نے صاحب کی درست تفصیل بتائی ہی کیوں۔

صوفی صاحب باہر آ کر گھر کی جانب چل دیے۔ دوست احباب راستے میں ملے لیکن روزہ کی حالت میں وہ ادھر ادھر رکنے کے عادی نہ تھے۔ اچانک گلی مڑتے ہوئے محلے کے چوراہے پر ایک عجیب منظر دیکھا اور اس پر وہ بے حد افسردہ ہو گئے۔

آج 29 واں روزہ تھا۔ صوفی صاحب عید کی خریداری کے حوالے سے بے حد مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے کلن کو ساتھ لیا اور مختلف سامان بازار سے خرید کر اس کے ہاتھوں گھر بھجوانے لگے۔

شام چار بجے جب وہ سامان کی آخری کھیپ لے کر گھر میں داخل ہوئے تو بیگم نیاز مند ان سے سوال کر بیٹھیں۔

"آپ کی اس قدر تیاری — میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"کیوں بیگم؟" وہ اپنی پھندنے والی ٹوپی ہلاتے ہوئے بولے۔ "کل عید ہو سکتی ہے، اس کی تیاری بھی تو کرنا ہے نا۔"

"تیاری تو ضروری ہے مگر اس بار تو آپ نے عید کے روز بھی یار دوست کی گھر پر دعوت نہیں رکھی۔"

"ہاں بالکل۔"

"نہ ہی میرے بھائی صاحب اس عید پر آئیں گے، نہ بچیاں نہ ماموں—" وہ کہہ رہی تھیں۔

"آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں بیگم!" صوفی صاحب انتہائی سادگی سے بولے۔

"تو پھر یہ دس کلو مرغی، بارہ کلو چاول، پانچ کلو فروٹ، چھ عدد کیک، بکری کے اتنے سارے لوازمات — آخر یہ کون کھائے گا؟"

"عید کے دن ہمارے ہاں بہت خاص مہمان آئیں گے، یہ سارے لوازمات ان ہی کے لیے ہیں۔" وہ سرشاری کے عالم میں بولے۔ "بس آپ دس پندرہ افراد کے کھانے کا انتظام کر دیجیے گا۔"

"دس پندرہ افراد — کون ہیں وہ خاص مہمان کچھ پتا تو چلے کہ کون آ رہا ہے۔"

بیگم نیاز مند حیرانی سے پوچھ رہی تھیں۔

"ابھی نہیں۔" وہ تجسس پیدا کرتے ہوئے بولے۔ "ان مہمانوں کو تو آپ اسی وقت پہچانیں گی جب گھر پر آئیں گے۔"

"میری سمجھ میں آپ کی یہ فضول خرچی نہیں آ رہی۔" وہ ابھی تک پریشان تھیں۔

"بیگم! یہ فضول خرچی نہیں، فراخ دلی ہے۔" وہ خوش دلی سے بولے۔ "آپ تو صرف اتنا بتایئے کہ میری اس دعوت کا اہتمام کر دیں گی یا—"

"جب تو آپ سامان لے ہی آئے ہیں تو کرنا تو پڑے گا کچھ نہ کچھ—" وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"بہت بہت شکریہ!" وہ بے حد خوشی کے ساتھ بولے۔

صوفی صاحب رقم خرچ کرنے کے معاملے میں اگر کنجوس نہ تھے تو کچھ زیادہ فیاض بھی نہ تھے۔ رقم کو کفایت سے خرچ کرنا ان کی عادت کا حصہ تھا۔ ہاں! یہ ضرور تھا کہ اگر ان کے دل میں کوئی خواہش مچل جاتی تو وہ بے سوچے سمجھے، چھوٹی یا بڑی ہر طرح کی رقم خرچ کرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اس وقت انھیں لاکھ کوئی عقل کی بات سمجھاتا لیکن وہ ایسے ہو جاتے جیسے انھیں سمجھ داری سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔

چاند رات کی مبارک ساعتیں سمیٹتے ہوئے صوفی نیاز مند عید کی صبح اٹھے اور عید گاہ نماز پڑھنے چلے گئے۔ اپنے دوستوں سے ملاقات کے بعد جب وہ گھر پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی بیگم ان مہمانوں کی خاطر مدارات کے انتظام میں لگی ہوئی تھیں۔

"بیگم! آپ کو بہت بہت عید مبارک ہو۔" وہ سیدھے کچن میں جا کھڑے ہوئے۔

"آپ کو بھی دلی عید مبارک ہو۔" ان کی بیگم نے کڑھائی میں رس ملائی ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی صاحب! مجھے تو عید کی مبارک باد دیجیے۔" کلن دروازے کی اوٹ سے بولا۔ وہ یہاں بیٹھا انار کاٹ رہا تھا۔

"ارے ہاں! کیوں نہیں، تمھیں بھی عید مبارک ہو۔ آؤ گلے مل لو۔" صوفی صاحب نے اسے اپنے پاس بلاتے ہوئے کہا۔

کلن نے جلدی سے میلے کپڑے سے انار والے ہاتھ

آ کر صوفی صاحب کے پاس آ گیا۔ صوفی صاحب
صاف بچ کر نکل / صوفی صاحب ... کی طرف آنے لگے۔
لے آنے لگے ... پھونک پھونک کر پینے لگے۔
"صوفی صاحب عیدی عیدی"
... تو عیدی کا ... "صوفی صاحب اس
... کی طرف توجہ کرتے ہوئے بولے۔ "پچھلی بار اس غریب کو عیدی
طرف سے 50 روپے عیدی کے طور پر دے دیے۔"
"... عیدی ... اور وہ بھی 50
روپے!"
"نہیں ... میں نے کچھ زیادہ کہہ دیا؟" وہ دانت پیستے
ہوئے بولے۔
"میں اس سے زیادہ عیدی لوں گا۔ بس!" وہ ... لگا
میں بولا۔
"میں نے ابھی پچھلی عید پر ہی تو تمھیں 100 روپے
عیدی دی تھی۔"
"وہ بھی تم عیدی تھی..." اس نے احتجاج کیا۔ "اور یہ اس

سے بھی کم ہے۔ آخر اس بار گھر 500 روپے عیدی دی تھی تو میں بھی
چھوڑ کر چل کروں گی۔" اس نے ... ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔
"مت ... تم ... بھی ... باتیں کر رہے ہو"
وہ تھوک نگلتے ہوئے کی وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ "کیا تم آج کل اخبار
پڑھنے لگے ہو؟"
"آپ بات کو ادھر ادھر گھما رہے ہیں۔ صرف عیدی عیدی کی
بات کریں۔" آج اس کا موڈ درست نہ تھا۔
"کچھ تھوڑی سی کمی کر لو۔" وہ اصرار کرنے لگے۔
"ہاں ہاں ایسے ہیں، کیوں تنگ کر رہے ہیں اس بے چارے
کو۔" ان کی بیگم سے رہا نہ گیا تو درمیان میں مداخلت کر بیٹھیں۔
"چلو بھئی دے دو انھیں 500 روپے، کیا یاد کریں گے۔"
دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولے۔
"آپ چپ رہیے۔" یہ کہہ کر فلں اس زور سے اچھلا کہ بیگم
کی چائے کی پیالی پر ہاتھ جا لگا۔ وہ تو شکر تھا کہ چائے ٹھنڈی
تھی لیکن وہ گرتے گرتے اس کے کپڑے کو رنگین کر گئی۔ صوفی
صاحب موقع کی نزاکت سمجھ کر فوراً دروازے سے باہر ہو گئے تھے ورنہ ان کی نئی شیروانی کا رنگ میں آنا یقینی تھا۔
"بس مل گئی نا تم کو عیدی۔" بیگم نہایت ... غصے سے بولیں۔
"وہ تو ... کیا کروں ... خوشی مجھے راس ہی نہیں آتی۔" وہ گھبرا کر ... سے اپنے کپڑے کو دیکھتے ہوئے بولا۔
"چلو اب جلدی

...ے کپڑے تبدیل کر
...مہمان آنے ہی
...ہوں گے۔" صوفی
صاحب نے کہا اور
...کی طرف
...دیکھنے لگے۔ کچھ ہی دیر
...گلی کی آواز سنائی
...صوفی صاحب
...میں تھے
...فوراً
...دروازے کی طرف
...وہاں ان
کے دوست چمن
...موجود تھے
خان
صوفی صاحب نے ان
کی لائی مہمانوں کو
...کر کے لانے پر
...ہوئی تھی۔

"میں مہمانوں کو لے آیا ہوں۔" چمن خان نے انہیں اطلاع دی۔

"کہاں ہیں، بلاؤ انہیں۔" صوفی صاحب خوشی سے بولے۔

"وہ رہے ——" یہ کہہ کر چمن خان پیچھے کی طرف مڑے اور انہوں نے مہمانوں کو اشارہ کیا۔ کوئی بارہ تیرہ بچے رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس دروازے کے پاس آئے۔ صوفی صاحب نے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب بلند آواز سے عید مبارک کہتے ہوئے اندر آ گئے۔ صوفی صاحب نے فرداً فرداً سب سے ہاتھ ملایا اور انہیں عید کی مبارک باد دی۔ بچے ان کے گھر آ کر بہت مسرت محسوس کر رہے تھے۔ وہ ادھر اُدھر اُچھل کود کر رہے تھے۔ کوئی صوفے پر چڑھ رہا تھا تو کوئی کرسی کھینچ رہا تھا۔ کوئی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا تو کوئی کچن کی طرف نکل گیا۔

بیگم نیاز مند نے شور کی آوازیں سنیں تو کچن سے باہر نکل کر دیکھا۔ اتنے سارے ان جانے بچوں کو دیکھ کر وہ چونکیں۔

وہ تمام بچے ان کی جانب آ چکے تھے۔ ان کی سمجھ میں صوفی صاحب کی یہ عجیب قسم کی مہمان داری نہیں آ رہی تھی۔ بچے ان سے علیک سلیک کر کے کچھ اور باتیں کرتے کہ صوفی صاحب نے انہیں بلا لیا۔ گلفام سے کہا کہ وہ جلدی سے کیک، نمکو، رس ملائی اور بسکٹس وغیرہ جلدی سے میز پر سجا دے۔ جب تمام لوازمات سج چکے تو بچوں کو کھانے کا اشارہ کیا۔ بیگم نیاز مند نے کیک کاٹنا شروع کیا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ بچے برسوں کے بھوکے ہوں۔ انہوں نے ہر طرح کے تکلفات کو بالائے طاق رکھا اور جس کے ہاتھ جو جس طرح آتا گیا، وہ کھاتا گیا۔ کسی نے کیک منہ میں ٹھونسا اور بسکٹ مٹھی میں بھر لیے، کوئی دونوں ہاتھوں میں دو دو پیس لیے اپنے پیٹ کو بھرنے میں مصروف تھا۔ کسی کو نمک میں مزہ آ رہا تھا اور کوئی رس ملائی شربت میں ڈبو کر کھا رہا تھا۔

بیگم نیاز مند ان بچوں کی بے تکلفانہ حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں، انہوں نے بچوں کو روکنے ٹوکنے کی بھی

کوشش کی تھی۔ صوفی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر انہیں ان کے دل میں جو سوال ہے وہ سمجھ لیا۔ پھر سے بچوں کی اور بیگم نیاز مند کو اپنے ساتھ کرتا ایک بیان ہے۔ کسی جگہ ایسا وقت تھا۔

ان بچوں کو تو بیگم نیاز مند ملامت کر چکی تھیں اب کر بچوں پیار کر کے بٹھاتا تھا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے ملنے کا پوچھا کہ ان کو کس نسبت کی بنا پر صوفی صاحب نے یہاں دعوت پر بلایا ہے۔

ابھی وہ کچھ سوچ رہی تھیں کہ صوفی صاحب نے انہیں سب کو کھانا پیش کرنے کا انتظار کرنے دیا۔ وہ تو بچے لگے اور ان کی خبر پھر یہاں شروع ہو گئی۔ وہ حیران تھے کہ اتنے غریب غربا بچوں کو آخر صوفی صاحب نے اپنے ہاں کیوں مہمان بلایا ہے؟

صوفی صاحب نے بچوں کو ڈھیر کا کھانا بھی خوب اچھے طریقے سے کھلایا۔ بچے مرغی، پلاؤ، کباب، زردہ اور بہت ساری اشیاء کھا کر بہت خوش ہوئے۔

"بچو! عید کے تینوں دن اسی وقت کھانا کھاؤ اور مزے کرو۔" صوفی صاحب بچوں سے مخاطب تھے۔ "تمہیں تمہاری پسند کی ہر چیز کھانے کو ملے گی۔"

"جی انکل! میں تو رات کو قورمہ کھاؤں گا۔" ایک بچہ چلاتے ہوئے بولا۔

"میں تو بھنڈی شوق سے کھاتی ہوں۔" ایک لڑکی خوشی سے چلائی۔

"انکل! ہماری عیدی۔" ایک اور لڑکے نے کہا۔

"تم سب فکر مت کرو۔ ہر بچے کی ہر خواہش ضرور پوری ہو گی۔" صوفی صاحب خوش دلی سے بولے۔ ان کے ماتھے پر کوئی شکن تک نہ تھی۔

بیگم نیاز مند ان کی اس طرح سے اٹھائی جانے والی ناز برداریوں کو دیکھ کر چڑ گئی تھیں۔ انہیں ان بن بلائے مہمانوں سے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ ایسے میں صوفی صاحب ان کے پاس آئے۔

"بیگم! آپ یقیناً ان بچوں کو دیکھ کر حیران پریشان ہوں گی۔" وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولے۔ "یہ وہ غریب بچے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ ان میں سے کوئی بچہ کسی بیوہ کا ہے جو گھروں کے برتن دھو کر یا لوگوں کے کپڑے سی کر اپنے یتیم بچوں کو پیٹ پالنے کی کوشش کرتی ہے تو کوئی بچہ ایسا ہے جو کسی گیراج پر سارا دن کام کرتا ہے اور شام کو آخر میں تنخواہ صرف استاد کی گالیاں کھاتا ہے بلکہ بھوک کے وقت استاد کا جھوٹا کھا کر خوش رہتا ہے۔"

وہ جذباتی انداز میں تقریر کر رہے تھے۔ "ان میں بلکہ بچے بچے تو ایسے ہیں جو کچرے سے اپنی روزی حاصل کرتے ہیں اور غربت کی حد تو یہ ہے کہ بھوک کے وقت یہ بچے اسی کچرے کے ڈھیر میں ہمارا پھینکا جانے والا رزق تلاش کر کے کھاتے ہوتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "ہم ان رات کتنا کھانا باہر اچھال دیتے ہیں لیکن کتنی بار ہم نے اللہ کی ان ہوئی نعمتوں میں سے کبھی کسی بھوکے کو بٹھا کر کھانا کھلایا ہے۔" وہ دکھی دل کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ "اس لیے اس بار میں نے سوچا کہ یہ عید ان غریب بچوں کے نام کر دی جائے۔ ان کے تمام کپڑوں، عیدی اور کھانے پینے کے اخراجات ہمارے ذمے۔"

ان کی بیگم، صوفی صاحب کے جذبات سے واقف ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بچوں کے پاس جا کر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور مخاطب ہوئیں۔

"بچو! یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ تمہارے انکل نے تو تمہیں تین دن کی دعوت پر بلایا ہے لیکن میرا تم سے یہ کہنا ہے کہ اگر کسی دن تمہارے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو اور تم ہمارے گھر کے نزدیک ہو تو پھر کسی کو بھی کچرے کے ڈھیر سے کھانا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، وہ بلا جھجک ہمارے گھر آ سکتا ہے۔"

ان کی آنکھوں سے بھی دو آنسو ٹپک پڑے۔ عیدی خوشیوں میں یہ آنسو انہیں بہت اچھے لگے تھے۔ صوفی صاحب کی جانب سے کیا جانے والا خرچہ انہیں ان ہنستے مسکراتے بچوں کی خوشیوں کے بدلے بہت معمولی لگ رہا تھا۔

★★★

آپ نے پوچھا؟

■ بیاہ موت یا بلیک ڈیتھ سے کیا مراد ہے؟ ______ (شبیر ثاقب' راولپنڈی)

ج: بلیک ڈیتھ بارھویں، تیرھویں صدی میں طاعون کو کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں یہ بیماری یورپ میں لاکھوں اموات کا باعث بنی۔ چونکہ اس دور میں صفائی اور حفظانِ صحت کا معیار بہت ناقص تھا اس وجہ سے یہ بیماری چوہوں اور دوسرے جانوروں مثلاً کتوں، بلیوں سے انسانوں میں منتقل ہو جاتی۔

■ بال پوائنٹ کے موجد کا نام بتائیں؟ ______ (صادق طفیل' لاہور)

ج: بال پوائنٹ "لازلو جوزف بیرو" نامی ایک شخص نے 1937ء میں ایجاد کیا۔ اس کا تعلق یورپی ملک ہنگری سے تھا۔

■ گوشت خور پودے کہاں پائے جاتے ہیں؟ ______ (اقرا یونس' راولپنڈی)

ج: گوشت خور پودوں سے مراد ایسے پودے ہیں جو اپنے اوپر بیٹھنے والے کیڑوں مکوڑوں کا شکار کرتے ہیں مثلاً وینس فلائی ٹریپ، سن ڈیو اور بلیڈر ورٹ وغیرہ۔ یہ زیادہ تر براعظم شمالی امریکہ اور بحرالکاہل کے جزائر میں پائے جاتے ہیں۔

■ دنیا کے سب سے گہرے اور سب سے کم گہرے سمندر کے نام بتائیں؟ ______ (حسن اختر' کراچی)

ج: سب سے گہرا سمندر، بحرالکاہل ہے، جبکہ بحیرہ بالٹک جس کے اطراف میں یورپ کے مشہور ممالک فن لینڈ، سویڈن، ناروے، لیٹویا، اسٹونیا اور لیتھونیا شامل ہیں، یہ دنیا کا سب سے کم گہرائی والا سمندر ہے۔

■ دنیا کی پہلی یونیورسٹی کہاں قائم ہوئی تھی؟ ______ (شاہد منصور علوی' کراچی)

ج: مصر کے شہر اسکندریہ میں آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے سکندرِ اعظم کے حکم سے ایک بہت بڑی درس گاہ قائم کی گئی تھی، جہاں اس زمانے کے تمام علوم سکھائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ٹیکسلا میں بھی ایک یونیورسٹی کی باقیات ملتی ہیں۔ اسے اس دور میں جولین یونیورسٹی کہا جاتا تھا۔ ایک تحقیق کے مطابق یہ آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل قائم کی گئی تھی۔ مورخین کے مطابق انہیں دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیاں کہا جا سکتا ہے۔

■ NASA کن الفاظ کا مخفف ہے؟ ______ (طیبہ منیر' اوکاڑہ)

ج: ناسا امریکی خلائی تحقیقی ادارے کا نام ہے اور اس سے مراد ہے:

"National Aeronautics and Space Administration"

سکس ملین ڈالر مین

وسیم بیگ

کیا آپ نے کبھی ایسا مافوق الفطرت انسان دیکھا ہے، جو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہو۔ اس کے ہاتھوں میں کسی کرین کے برابر طاقت ہو یا پھر اس کی آنکھ میلوں دور تک دیکھ

Lee Major

سکتی ہو؟ جی ہاں! آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہم بات کر رہے ہیں آج سے تقریباً تین دہائیوں قبل ٹیلی ویژن کے ایک مقبول عام پروگرام "سکس ملین ڈالر مین" کی۔

یہ پروگرام ایک ایسے خلاباز کے بارے میں تھا جس کے دونوں پیر، ایک ہاتھ اور ایک آنکھ حادثے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ اسٹیو آسٹن نامی یہ خلاباز اپنی غیرمعمولی صلاحیتوں کی وجہ سے اس ادارے میں بہت اہمیت کا حامل تھا، اس لیے سائنس دان یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اسٹیو کو دوبارہ اس قابل ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دو مشینی ٹانگیں، ایک مشینی ہاتھ اور ایک برقی آنکھ تیار کی جاتی ہے، جن کو اسٹیو کے جسم کے ضائع شدہ اعضاء کی جگہ لگا دیا جاتا ہے اور ان کو کنٹرول کرنے کے لیے دماغ میں ایک مائیکرو چپ لگا دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ ایک بار پھر سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کمال کی بات یہ ہوتی ہے کہ اس کی مشینی ٹانگوں اور ہاتھ میں عام انسانوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ طاقت تھی اور اس کی برقی آنکھ میں کئی میل دور تک دیکھنے کی صلاحیت تھی۔ اس منصوبے کی تکمیل پر چھ ملین امریکی ڈالر کے اخراجات آئے۔ جب اسٹیو کو دوبارہ خلاباز کے طور پر آزمایا گیا تو اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ اب اس کام کے قابل نہیں رہا۔ اتنے اخراجات کے بعد یہ بات ناقابل برداشت تھی، اس لیے اسٹیو سے کوئی دوسرا کام لینے کا فیصلہ کیا گیا اور اسے امریکی پولیس کے خفیہ محکمے میں سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر شامل کر لیا گیا۔ یوں پہلا بایونک سیکرٹ سروس ایجنٹ کا کردار تخلیق ہو گیا۔ یہ پروگرام دنیا بھر میں بے حد مقبول ہوا اور بچے جگہ جگہ اسٹیو آسٹن کی نقل کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ اسٹیو آسٹن کا کردار ایک امریکی اداکار لی میجرز نے کیا تھا۔

اس دور میں اس پروگرام کو محض ایک سائنس فکشن جیسی (Fantasy) سمجھا جاتا تھا، لیکن درحقیقت یہ بایونکس انڈسٹری کا آغاز تھا۔ طب کے شعبے والوں کے لیے بھی تحقیق کی نئی شروعات تھیں کہ کس طرح حادثاتی طور پر ضائع ہو جانے والے انسانی اعضاء کو مشینی پیوند کاری کے ذریعے قابل استعمال بنایا جا سکے گا۔

گذشتہ دنوں تجرباتی بایولوجی 2006ء کی میٹنگ میں دنیا بھر سے 12000 وفود نے شرکت کیں، اس میٹنگ میں ماہرین نے بتایا کہ وہ "سکس ملین ڈالر مین Hu" کی تکمیل کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں، جو بالکل اسٹیو آسٹن کی طرح ہی ہو گا۔ اس

چنانچہ میں ماہرین نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح کسی انسان میں مکمل طور پر برقی ہاتھ، پاؤں اور آنکھ کام کر سکتی ہے۔

مصنوعی ٹانگ: کمپیوٹر سے کنٹرول ہونے والے یہ 200 پونڈ وزن بھاری اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان ٹانگوں کو انسانی جسم کے ساتھ برقی پٹیوں کی مدد سے منسلک کر دیا جائے گا۔ ٹانگوں سے منسلک مصنوعی ٹانگیں، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا برکلے کے سائنسدان ہمایوں کزرونی (Humayayoou Kazarooni) نے تیار کی ہیں۔ ڈاکٹر کزرونی کا کہنا ہے یہ بہت زیادہ تیزی سے حرکت کر سکتے ہیں، خاص طور پر عسکری مقاصد میں تو ان کو بہت ہی کارآمد

کہا جا رہا ہے، ان کی مدد سے سپاہی کہیں زیادہ وزن اٹھا کر بآسانی چل سکتے ہیں، گویا ان میں سپرمین کی طاقت آ جائے گی۔

مصنوعی ہاتھ: بائیونک ہاتھ کو "ڈیکسٹرا" Dextra کا نام دیا گیا ہے، اس مصنوعی ہاتھ کی انگلیاں دماغ میں نصب مائیکرو چپ کی مدد سے کام کرتی ہیں اور ان کو فائبر آپٹکس کی مدد سے دماغ کے اعصابی سسٹم سے منسلک کیا گیا ہے۔ اس کے سنسرز (Sensors) کو انگلی کے پیچھے کی طرف لگا دیے گئے ہیں۔ اس کو استعمال کرنے والا تھوڑی سی تربیت کے بعد اس مصنوعی ہاتھ کو قدرتی اعضا کی طرح سے استعمال کر سکے گا۔ ڈیکسٹرا کا استعمال کنندہ اپنی انگلیوں کو بالکل ایسے ہی استعمال کر سکے گا، جس طرح وہ اپنے قدرتی ہاتھ کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

برقی آنکھ: بائیونک آنکھ کی تیاری کا کام مذکورہ ٹیکنالوجی کا سب سے زیادہ پیچیدہ اور حساس کام ہے۔ بائیونک آنکھ کے استعمال کے لیے ایک جیبی سائز کا کمپیوٹر پروسیسر ڈیزائن کیا گیا ہے اور اس میں مختصر سی بیٹری لگائی گئی ہے، ریٹنا (Retina) کے ساتھ ایک چاول کے دانے کی جسامت سے بھی مختصر چپ لگائی گئی ہے اور ایک مختصر سا ویڈیو کیمرا خصوصی شیشے پر لگا دیا گیا ہے۔ اس آنکھ کی مدد سے ان افراد کو فائدہ پہنچے گا، جو کسی بیماری کی وجہ سے اپنی بینائی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

برقی کان: یونیورسٹی آف سارلینڈ جرمنی کے ماہرین نے سب سے پہلے اس بات پر تحقیق کی کہ انسانی دماغ کس طرح سے کان کے پردے پر پڑنے والی آواز کو شناخت کرتا ہے اور کان کے پردے اور دماغ کے خلیوں کے درمیان کس طرح رابطہ قائم ہوتا ہے، اس تحقیق کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں ماہرین نے نہایت مختصر قامت مائیکرو چپ تیار کی ہے، جو سماعت سے محروم افراد کے لیے بالکل ایسے کام کرے گی، جیسے عام انسان کا سماعتی نظام کام کرتا ہے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے "Cochlea" نامی آلہ استعمال ہو رہا ہے، جو دیگر سماعتی آلات سے مختلف ہے اور جس کے استعمال سے بہت مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔

مندرجہ بالا کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں سکس ملین ڈالر مین حقیقت کا روپ دھار لے گا۔

☆☆☆

آپ بھی لکھیے

طنز بری عادت ہے

بازلہ سعید، بہاولپور

کسی پر طنز کرنے کا کتنا اچھا موقع کیوں نہ ہو اور آپ کی خواہش اور خوشی اسی میں ہو کہ اس کو طعنوں کا نشانہ بنایا جائے۔ لیکن پھر بھی آپ چند لمحے ٹھہر کر سوچ لیں کہ آپ کی چند لمحوں کی خوشی کسی دوسرے کے دل میں کتنا گہرا گھاؤ لگا دے گی۔ کیونکہ زبان اگرچہ تلوار نہیں پر تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ بات اگرچہ تیر نہیں مگر تیر سے زیادہ زخمی کرتی ہے۔

کسی کی دل شکنی کے بعد دل جوئی کے ہزاروں طریقے ہیں۔ مگر کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے مگر اس زہر کا اثر زائل کرنا محال ہے۔ کیونکہ صرف ہاتھوں سے لگائے گئے زخم گہرے نہیں ہوتے بلکہ زبان سے لگائے زخم زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ کوشش کیجئے کہ اپنے نیک افعال سے لوگوں کا دل جیتیں اور جہاں تک ممکن ہو، لوگوں سے نرمی محبت اور شفقت کا سلوک کریں۔

کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن ترازو میں جو چیز سب سے زیادہ بھاری ہوگی، وہ حسن اخلاق ہے۔

(پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

قوم کا محسن

محمد جنید، واہ کینٹ

اگر غور سے دیکھا جائے تو استاد کی حیثیت، اہمیت اور مقام مسلم ہے۔ استاد ہی نونہالان وطن کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ استاد ہی قوم کے نوجوانوں کو علوم و فنون سے آراستہ کرتا ہے۔ والدین بچے کی جسمانی پرورش کرتے ہیں۔ جبکہ استاد کے ذمہ اس کی روحانی تربیت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا "جس شخص نے مجھے ایک لفظ سکھایا وہ میرا استاد ہے اور میں اس کا احترام کرتا ہوں۔" مشہور خلیفہ ہارون الرشید کے بیٹے مامون اور امین اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ استاد کے جوتے کون اٹھا کر لائے۔ آخر دونوں نے مل کر ایک ایک جوتا اٹھا لائے۔ حضرت امام غزالی کا قول ہے "جب تک تم اپنا سب کچھ علم کو نہ دے دو، علم تمہیں کچھ نہ دے گا۔" جہاں طالب علم پر یہ ذمہ داری آتی ہے کہ وہ استاد کا احترام کرے وہاں استاد کو بھی چاہیے کہ اپنے طلبہ پر محبت سے توجہ دے۔ انہیں آئندہ کے لیے درخشندہ ستارہ بنانے کی کوشش کرے۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ استاد کے سامنے تکبر و غرور نہ کرے بلکہ عاجزی و انکساری اور ادب سے پیش آئے اور کبھی بھی استاد سے نہ جھگڑے۔ علامہ اعظم کہا کرتا تھا "میرا باپ مجھے زمین پر لایا اور میرا استاد مجھے زمین سے آسمان پر لے گیا۔" سب سے اہم استاد علامہ اقبال، مولوی میر حسن کے شاگرد تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ایک دفعہ سیالکوٹ کے ایک بازار میں علامہ اقبال نے اپنے استاد کو چلتے دیکھا تو علامہ اقبال ننگے پاؤں اپنے استاد کو گھر تک چھوڑ آئے۔

طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ استادوں کا ادب کریں اور ان کا ہر طرح سے خیال کیا کریں۔

(دوسرا انعام 80 روپے کی کتابیں)

قلم

مرحل شاہ اللہ، میانوالی

قلم خیالات کو سطح کاغذ پر منتقل کرنے کی ایک ایسی قوت ہے جس میں پہاڑوں کی سربلندی، سمندروں کی روانی، گہرائی اور مہر و ماہ کی روشنی ہے۔ جب دماغ لکھتا ہے تو قلم چلتا ہے اور جب قلم چلتا ہے تو دل لکھتا ہے۔

قلم جب مہربان کے ہاتھ میں ہو تو خون کی روانی کا کام...

جب قلم کے ہاتھ میں ہو تو بوٹیاں توڑتا ہے۔ جب سیاست
دان کے ہاتھ میں ہو تو وحشت و تجبر سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔
سب سے زیادہ عزت مند قلم اس کا ہے جس نے علم کی تحریر لکھی اور
سب سے زیادہ خطرناک قلم اس کا ہے جس نے کسی بھی جھوٹی دستاویز
پر دستخط کیے۔ (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

بہترین دوست

سہیل صغیر، فیصل آباد

یہ بات بالکل درست ہے کہ کتاب انسان کی بہترین ساتھی ہوتی ہے۔ کتاب سے محبت اور دوستی اچھی لوگوں کو ہوتی ہے جو علم کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ کتاب اپنے اندر علم کا خزانہ چھپائے ہوتی ہے جو کبھی نہ ختم ہونے والا ہے اور اسے وہی شخص تلاش کر سکتا ہے جو حصول علم کی سچی تڑپ رکھتا ہو۔ ان لوگوں کے لیے کتاب ایک بہترین دوست ہے۔ بلکہ ایک راہنما بھی ہے، جو اپنے پڑھنے والوں کو زندگی کی تمام اچھائیوں اور برائیوں سے آگاہ کرتی ہے اور سیدھے راستے پر چلنے کی تلقین کرتی ہے۔ یہ انسان کے ذہن کو وسعت دیتی ہے اور اسے گہرائی میں جا کر سوچنے اور غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

کتاب گھر بیٹھے دنیا کی سیر کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ کتاب سے دوستی رکھنے والا شخص کبھی تنہائی کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ جب بھی کوئی نئی کتاب پڑھتا ہے تو اسے ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ جس میں وہ اپنے آپ کو چلتا پھرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ کتاب ہر بار اسے نئے نئے عجائبات دکھاتی ہے۔ جو آدمی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے اسی لیے کتاب سے بڑھ کر کوئی رفیق، ہمدرد اور ہمجولی نہیں۔ یہ ایک انمول دولت ہے اور بیش قیمت جوہر ہے۔ اسی لیے ہمیں چاہیے کہ اسے ہمیشہ اپنا دوست رکھیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتب سے حاصل ہونے والے علم پر عمل کریں اور دوسروں کو کتاب پڑھنے کی ترغیب دیں۔ (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

غربت

نازیہ جدون، پشاور

گرمی کا موسم تھا اور بہت زیادہ گرمی پڑ رہی تھی۔ احمد بیٹھا ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ احمد نے آواز سنی مگر سستی سے ٹس سے مس نہ ہوا کہ دروازہ کھول لے۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت دستک دینے والا کون ہے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ گھنٹی بجنے لگی۔ احمد کی امی نے کچن سے احمد کو دروازہ کھولنے کا کہا اور احمد کو ناچار اٹھنا پڑا۔ احمد نے دروازہ کھولا۔ سامنے گندگی سے اٹے کپڑوں میں بچے کھڑے روٹی مانگ رہے تھے۔ احمد کا تو پہلے سے ہی پارہ چڑھا ہوا تھا۔ یہ سنتے ہی اور زیادہ غصہ میں آیا۔ "ابھی تو دے دیتا ہوں مگر اس کے بعد کبھی مت آنا" احمد نے بچوں کو ڈپٹ کر کہا۔ احمد کو گندگی اور گندے بچوں سے سخت چڑ تھی۔ اس کو غریبوں سے محض اس وجہ سے انتہا درجہ کی کوفت محسوس ہوتی تھی۔ امی کچن کے کام سے فارغ ہوتے ہی احمد کے پاس آئی اور اس کو سمجھانے لگی۔ "بیٹا! یہ غریب لوگ بھی معاشرے کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ ان کی بھی وہی عزت ہوتی ہے جو اوروں کی ہوتی ہے۔ اگر یہ غریب لوگ نہ ہوتے تو ان سے متعلق بہت سے کام ہم کو خود ہی کرنے پڑتے۔ زمین پر اگنے والے پھل، پھول اور سبزیاں سب انہی غریبوں کی محنت ہی تو ہے اور بیٹے اگر غربت کوئی گناہ یا بری شے ہوتی تو حضور پاک ﷺ بھی اللہ تعالیٰ سے امیر بننے کی دعا کرتے جنہوں نے اپنی پوری زندگی غربت اور کسمپرسی میں گزاری۔" امی یہ کہہ کر کسی کام سے دوسرے کمرے میں چلی گئیں مگر احمد کو روشنی کی ایک نئی راہ دکھا گئیں۔

(پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

انعامی بانڈ

تحریم افضل، راولپنڈی

جب کسی کا انعامی بانڈ نکلنے والا ہوتا ہے تو وہ بہت بے چین ہوتا ہے مگر کیا کسی نے کبھی سوچا ہے کہ اصلی انعامی بانڈ تو زندگی کے بعد اللہ کی عدالت میں نکلنے والا ہے اور جس میں کامیابی حاصل کرنا بہت خوش قسمتی کی بات ہے۔ اس انعامی بانڈ میں کامیابی کا اہم ذریعہ نیکیاں ہیں جن کو حاصل کر لینے سے اس انعامی بانڈ میں کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہر انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا کے انعامی بانڈ کی فکر نہ کرے بلکہ آخرت کے انعامی بانڈ کی فکر کرے تاکہ وہ اپنی اصلی منزل کو پا لے۔

☆☆☆

دم ہے تو!

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرہ افتاد

(اقبال)

9 نومبر کی ایک روشن اور سہانی صبح تھی۔ اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ پر ایک غیر ملکی ائرلائن "ہائی فلائیٹ" کا طیارہ بوئنگ 737B ایک اڑان پرواز کے لئے تیار تھا۔ طیارے کا عملہ ڈگل تھا۔ طیارے کا کپتان پاکستانی نژاد محمد شاہین اور ایک غیر ملکی کو پائلٹ جان ہیری کاک پٹ میں اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ فلائیٹ ایک بریفنگ کے بعد کنٹرول ٹاور سے اجازت لے کر جہاز نے آہستہ آہستہ رن وے پر رینگنا شروع کیا۔ اس وقت جہاز میں عملے کے 9 افراد کے علاوہ 141 مسافر سوار تھے جن میں بیشتر غیر ملکی تھے۔ جہاز کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں اور مسافروں کو حفاظتی بند باندھنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ جہاز ٹیکسی کرتا ہوا رن وے کے سرے پر پہنچا اور پھر پوری طاقت سے ہوا کو چیرتا ہوا فضا میں بلند ہو گیا۔ اس وقت اسلام آباد میں موسم خاصا ابر آلود تھا۔ جہاز مقررہ بلندی پر پہنچ کر اپنی مطلوبہ سمت پر محو پرواز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جہاز کی بتیاں روشن ہو گئیں اور حفاظتی بند کا اشارہ بھی بجھا دیا۔

کچھ تھوڑے سے ملنے کے بعد کیپٹن محمد شاہین کی آواز جہاز میں گونجی۔ وہ انگریزی اور اردو میں اعلان کر رہے تھے "خواتین و حضرات ہم منصوبے کے مطابق ہے۔ ہماری منزل کیپٹن کا ... ہم پہنچنے ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم کچھ دیر بعد عظیم پہاڑی سلسلے قراقرم کے اوپر سے پرواز کریں گے اور آپ لوگ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی K2 کا نظارہ کر سکیں گے شکریہ۔"

جہاز میں کیپٹن محمد شاہین کے بیٹے انس اور حنیفہ بھی موجود تھے۔ انس اسلام آباد کے ایک ڈگری کالج میں اردو ادب کا طالب علم تھا۔ حنیفہ میڈیکل میں سال اول کی طالبہ تھی۔ انس نے اپنے پاس میں بیٹھے پٹھان بزرگ کو بتایا کہ وہ اپنے ابو کیپٹن محمد شاہین کے ساتھ چین کی سیر کرنے جا رہے ہیں اور واپسی پر بین الاقوامی تقریری مقابلے "اقبال ہمارا ہے" میں حصہ لیں گے۔ اچھا اقبال تو ہمارا بھی پسندیدہ شاعر ہے۔ یارا تم تقریر سناؤ۔ پٹھان بزرگ کے اصرار پر انس مسافروں کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور تقریر کرنے لگا۔ مسافر بھی اس کی تقریر غور سے سننے لگے۔ کیونکہ اس وقت ٹی وی پر اردو فلم دکھائی جا رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا:

محترم حاضرین! السلام علیکم! آج 9 نومبر کا دن ہمیں حضرت علامہ اقبالؒ شاعر مشرق کی ولادت یاد دلاتا ہے کہ کس طرح سیالکوٹ کے محلہ چوڑی گراں میں جنم لینے والا بچہ اپنی قوم کا رہبر و رہنما بنا۔ میں آپ کو روایتی مقررین کی طرح اقبال کا معروف شعر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

[illegible] اقبال کے پیغام پر عمل [illegible]
[illegible] اقبال کا مقصد تھا امت مسلمہ کی بیداری اسی
[illegible] کرتے ہیں کہ

[illegible] بستہ کو بالا کرے
[illegible] سے تہ و بالا کرے

[illegible] اقبال ہمیں دکھانے آئے تھے۔ وہ عمر بھر [illegible]
[illegible] دیکھتا ہے کہ
[illegible] اگر زندوں میں ہے

[illegible] تقریر جاری تھی ادھر کاک پٹ میں [illegible] اس نے اپنی نشست پر سر ٹکا کر آنکھیں [illegible]

"[illegible] تم کچھ بے چین لگ رہے ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہوں... مگر ذرا پریشان ہوں۔"

"میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں... کیا مسئلہ ہے؟"

"بس اتنا سا مسئلہ ہے میری رقم کہیں پھنسی ہوئی ہے بہرحال مدد کی پیشکش کا شکریہ۔"

اب شاہین خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس بولنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ جہاز اب بلند پہاڑی سلسلے پر سے گزر رہا تھا۔ موسم اچھا تھا۔ شاہین کی تمام تر توجہ پرواز پر تھی۔

اُدھر انشا جہاز کے کیبن میں اپنی تقریر کا اختتام کر رہا تھا۔

"محترم حاضرین! میرا مقصد محض تقریر کرنا نہیں بلکہ آپ کو پیغام اقبال یاد دلانا ہے کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اپنی زندگی کا مقصد پورا کیجیے۔ علامہ اقبال ہم سے بہت پر امید ہیں ان کی امید پر پورا اتریے۔ وہ تو خود کہہ رہے ہیں کہ

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

انشا حاضرین کی داد وصول کر کے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

خان بابا ہنس کر بولے "ہمارا جوان تو کمال کرتی ہے۔"

منیزہ تڑپ کر بولی "انکل خان بابا یہ ان باتوں کے علاوہ بڑی باتیں بھی کر سکتا ہے۔ ابھی کل کی ہی بات ہے اس نے میرا سیب کھا لیا اور اس کے چھلکے ہمارے پالتو بکرے کے پاس پھینک آیا۔ اب آپ ہی بتائیں کیا بکری کو چھلا ہوا سیب کھلانا منع ہے؟"

انشا نے جواب میں بہن کی بھی تعریف بیان کی اور ان دونوں کے درمیان کھلی جنگ کا آغاز ہوا تو خان بابا ہنس ہنس کر مرچ مسالا لگانے لگے۔۔۔ "بہت خوب لڑکا ٹھیک کہتی ہے۔۔۔ اور لڑکی

سو رہے تھے۔

لگ گئے تھے۔ "ہمیں یہاں بیٹھے … تم کو ہوا جہاز کی پرواز بھی پہلے سے بلند کر دی ہے … ابھی تک انہیں سوتے پایا۔ … شاہین نے دیکھا … جہاز کے کنٹرول کو چیک کی پشت پر … شاہین نے مسافروں کو کھانے … کاک پٹ سے باہر نکل کر مسافروں … پینے کی اشیا سپلائی … اس نے مردوں کو چائے … اپنے بچوں کے پاس جا کر … کے ساتھ جائے گا۔ اب وہ کاک پٹ میں واپس بیٹھا تو نیری جہاز کا کنٹرول سنبھالے ہوئے تھا اور موسیقی بھی سن رہا تھا۔

"نیری! تم بے شک آرام کرو، میں کنٹرول سنبھالتا ہوں۔"

شاہین نے چاہتے ہوئے کہا۔

"میری طبیعت ابھی بھی خراب نہیں، اگر خراب ہوتی تو میں پاکستان میں ہی … اتار لینے کی درخواست کرتا۔" شاہین نے اپنی نشست سنبھال لی اور اعلان کیا کہ طیارہ اب چین کی حدود میں داخل ہو چکا ہے اور ہم اس وقت … ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں۔

نیری نے اب موسیقی بند کر دی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اچانک شاہین کی نگاہ خودکار ریڈیو کمپس پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ طیارے کا رخ بیجنگ کی بجائے کسی اور سمت جا رہا تھا۔

"ارے! تم غلط فلائی کر رہے ہو، اپنی ڈائریکشن چیک کرو۔"

وہ نیری سے بولا۔

"نیری ابھی غلطی نہیں کرتا۔ میں اس وقت صرف پائلٹ نہیں بلکہ ہائی جیکر بھی ہوں۔" اسے جواب ملا۔

"ہوش کے ناخن لو... میں تیری حماقت چھپانے پر تیار ہوں۔ جہاز کا رخ موڑ ورنہ تم جانتے ہو کہ یہ خصوصی پرواز حکومت پاکستان کی فرمائش پر شروع کی گئی ہے تاکہ یورپی افراد باسہولت چین جا سکیں۔ اس طیارے کا اغوا پاکستان کی عزت پر دھبا ہوگا اور تم جانتے ہو کہ پاکستان اپنے اوپر دھبا برداشت نہیں کرے گا۔ نتائج کا سوچ لو۔"

وہ بولا "آج مجھے بہت بڑی رقم ملے گی۔ دہشت گرد مجھے مالامال کر دیں گے، بلینک چیک اور رہنے کے واسطے ایک جزیرہ۔"

شاہین نے نیری پر حملہ کرنے کے لیے پینترا بدلا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ گو شاہین جسمانی طور پر نیری سے کہیں زیادہ طاقت ور اور پھرتیلا تھا لیکن نیری نے کسی چالاکی سے شاہین کو باہر نکال کر کاک پٹ بند کر لیا تاکہ وہ اطمینان سے طیارہ کہیں اور لے جائے۔

شاہین نہیں چاہتا تھا کہ مسافروں کو اس مسئلے کا علم ہو مگر نیری نے خود ہی اعلان کر کے انہیں مطلع کیا کہ طیارہ اغوا ہو چکا ہے۔ سب مسافروں میں یک دم ہلچل مچ گئی، عورتیں رونے لگیں۔ بچے کچھ سہمے ہوئے تھے کہ شاید طیارہ تباہ ہونے جا رہا ہے، بس وہ بھی عورتوں کا ساتھ دینے لگے۔ جہاز کا عملہ شاہین کے ساتھ مل کر مسافروں کو دلاسے دے رہا تھا۔

ایک آسٹریلوی بولا "اس ہوا باز نے اسلحہ کہاں سے حاصل کیا۔ کیا پاکستان سے؟"

ایک انگریز لڑکی بولی "ہمیں دلاسا دیں جو بھی ہوگا اب برا ہی ہوگا۔" اور خان بابا کہہ رہے "یہ کافر کا بچہ ہمارے قابو آ گیا تو اپنے کتوں کے سامنے ڈال دوں گا جو روزانہ ایک بھیڑ کا گوشت کھاتے ہیں۔"

انشا اپنے ابو کے پاس آ گیا "ابو! آپ کاک پٹ کا دروازہ کیوں نہیں کھلواتے... اسے توڑ ڈالیں۔"

"بیٹا یہ دروازہ اندر سے ہی کھلے گا... یہ بہت مضبوط ہے اسے توڑنا آسان نہیں۔"

انشا کچھ سوچ کر بولا "اقبال ہی تو کہتے ہیں کہ۔

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

تو پھر آپ ڈیڑھ سو افراد کی زندگی ایک مجرم کے ہاتھوں میں نہ دیں... کیا آپ خود شاہین ہو کر بھی پرواز سے تھک رہے ہیں کسی طرح بھی اس شیطان کو قابو کریں۔"

تب شاہین چونک اٹھا۔ اس نے کچھ سوچ کر ایک انجینئر کو بلایا اور کاک پٹ کے باہر موجود ایک بکس کھلوا کر ایک پائپ بند کروا دیا۔ یہ پائپ ہوا بند کاک پٹ میں آکسیجن مہیا کرتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد نیری انٹرکام پر چیخ اٹھا۔

"شاہین تم زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ اور پائپ کھول دو ورنہ

تباہ کر دوں گا۔"

شاہین نے کمال ہوشیاری سے جواب دیا "مسٹر ہیری آپ کو غلطی ہوئی ہے اس وقت جہاز میں آکسیجن کا لیول خطرناک حد تک کم ہو چکا ہے مسافر بے ہوش ہو رہے ہیں اب ایمرجنسی لینڈنگ بے حد ضروری ہے۔"

ہیری نے جواب میں اسے گالیاں دے کر کہا کہ وہ جہاز کو تباہ کر دے گا۔

"ہیری بیوقوف انسان کو بزدل بناتی ہے تم ایسا نہیں کر پاؤ گے [illegible] کہاں جائے گا۔" شاہین نے کہا۔

ہیری بولا "شاہین ڈیئر! میں تمہیں بھی حصہ دلوا دوں گا پلیز آکسیجن سسٹم ٹھیک کر لو۔"

"میں شاہین ہوں غرور نہیں کھاتا، کاک پٹ کھولو، میں ایمرجنسی لینڈنگ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

ہیری جواب میں اول فول بکنے لگا تو شاہین نے فون بند کر دیا اور کاک پٹ میں موجود سپیکرز بھی آف کر دیے وہ چاہتا تھا کہ ہیری بیمار ذہن کا ہے یہ مسافروں کو بلیک میل کر کے آکسیجن کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ چند لمحوں بعد کاک پٹ کا دروازہ کھلا تو اس میں سے ہیری برآمد ہوا اس نے ماسک سنبھال رکھا تھا اسے شاہین کہیں نظر نہ آیا اور آتا بھی کیسے ... وہ تو گھات لگائے کھڑا تھا اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے اس کا ماسک ہوا میں اچھال دیا جو خان بابا نے قابو کر لیا۔ پھر دونوں ہواباز الجھ پڑے۔ صرف چار پانچ سیکنڈز میں شاہین نے دشمن کو قابو کر لیا۔

خان بابا نے ماسک تان کر کہا "ہم بہت بڑا نشانہ باز ہے ذرا چیا مار گراتا ہے ہم اب اس چوہے کے بچے پر نشانہ لگائے گا۔"

شاہین نے خان بابا کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے روکا اور کاک پٹ میں جا کر جہاز کا کنٹرول سنبھال لیا۔ ہیری نے اعتراف کر لیا کہ وہ دہشت گردوں کا ساتھی ہے اور دہشت گرد نہیں چاہتے کہ پاک چین دوستی قائم رہے کیوں کہ چین گوادر میں دنیا کا بہت بڑا سی پورٹ بنا رہا ہے۔ گوادر میں بندرگاہ مکمل ہوتے ہی دنیا کے دوسرے تجارتی اڈوں کا رخ ادھر ہو جائے گا اور پاکستان کے دشمنوں کو یہ گوارا نہیں۔ لہٰذا طیارہ اغوا کر کے پاکستان کو بدنام کرنا تھا۔

بیجنگ کی زمین سے وہیل کے ٹائرز چھوتے ہی تھے کہ دور دور تک ایئرپورٹ سیکورٹی نے محاصرہ کر لیا اور ہیری کو گرفتار کر لیا گیا۔

ہواباز شاہین نے سارا اعزاز اپنے شاہین بچے انشا کو دیا۔ شاہین نے پیار سے انشا کے سر میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی تو اس کی انگلیاں اس کے بڑے بڑے بالوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

وہ ڈانٹ کر بولا "گدھے! یہ بال کیوں اتنے بڑھا رکھے ہیں؟"

وہ معصومیت سے بولا "حضرت علامہ صاحب ہی کہتے ہیں کہ

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

☆☆☆

سوال

"چور۔۔۔ چور۔۔۔ چور"

اس بڑے سے ڈپارٹمنٹل اسٹور پر عید کی خریداری کرتے ہوئے اچانک میرے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی۔ نیچے ایک عجیب شور سا برپا تھا۔ "چوری اور یہاں؟" سیلز مین لڑکے سے رسید بنواتے ہوئے میں نے حیرت سے پوچھا۔ "ہاں جی۔۔۔ ہو جاتا ہے کبھی کبھار اس طرح بھی، اتنا بڑا اسٹور ہے۔ کچھ گاہک سامان لے کر ادائیگی کیے بغیر نکلنے کی کوشش میں پکڑے جاتے ہیں۔ آخر ہمارا بھی سیکیورٹی سسٹم ہے جی۔" سیلز مین ہنس کر بولا۔ رسید لے کر میں سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور نیچے اترتے ہوئے سامنے کا منظر نظر آتے ہی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ایک سیلز مین جھیمو کا بازو پکڑے ہوئے تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھا۔ اس میں وہی سامان تھا جو کل میں لے آئے رکھوایا تھا یا وہ واقعی چوری کرتے پکڑی گئی ہے؟ میں نے پریشانی سے سوچا۔ روتی ہوئی جھیمو چلا رہی تھی۔ "یہ سامان میرا ہے۔ میں چور نہیں ہوں۔ یہ تو میں نے کل خریدا تھا۔ یہ مجھے میری باجی نے لے کر دیا تھا۔" الفاظ ہچکیوں کے ساتھ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ لیکن وہاں اس کی سن کون رہا تھا۔ دکان عید کی شاپنگ کے لیے آنے والوں سے بھری ہوئی تھی۔ دکاندار، سیلز مین اور گاہک ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ "شکل تو دیکھیں کتنی معصوم لگتی ہے۔"

"کام دیکھیں اور عمر دیکھیں۔"

"شکل مومناں، کرتوت کافراں۔"

"ہو جی شکل پہ نہ جائیں، پولیس کو بلائیں پولیس کو۔ یہ کوئی گینگ ہے جو بچوں سے باقاعدہ چوریاں کرواتا ہے اور عید بقر عید پر تو ان کی اور چاندی ہو جاتی ہے۔" ایک گاہک افلاطون بنا دکان کے مالک کو مشورہ دے رہا تھا۔

"توبہ توبہ۔۔۔ قیامت کی نشانی ہے یہ تو۔" دو عورتیں استغفار پڑھتی جا رہی تھیں۔

"مگر میں چور نہیں ہوں۔ یہ سامان میرا ہے۔" جھیمو ہسٹیریکل ہو کر چلائی۔ "اچھا یہ سامان تیرا ہے تو لا دکھا اس کی رسیدیں؟" سیلز مین اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"رسیدیں۔۔۔؟ رسیدیں تو باجی کے پاس ہیں۔" جھیمو کی آواز جیسے گہرے کنوئیں سے نکلی۔ "ہوں تیری تو۔۔۔ ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔ باجی کی بچی! اوئے۔۔۔ ذرا سامان تو چیک کرو ذرا

"...اس بیچاری کی بچی نے۔" دوکاندار بولا اور ایک سیلز مین نے
... الٹا دیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا۔ اس میں وہی
... اور جیولری تھی جو کل اسے میں نے خرید کر دی تھی۔
... دوکان پر لانے سے اس کا مقصد کیا تھا؟ میں
... ڈھال سی جھمو اب فرش پر گھٹنوں پر سر
... "یہ سامان میرا ہے ۔۔۔ میں چور نہیں۔" اس کی آواز
... رہی تھی۔ "دیکھیں جی ۔۔۔ میں نہ دیکھ لیتا تو ہمیں
... کا چونا لگا گئی تھی۔" جس سیلز مین نے اسے پکڑا
... تھا۔ کہتی ہے یہ سامان اس کا ہے۔ شکل دیکھی
... سامان والی۔"

اچھا ۔۔۔ تو چور نہیں ہے تو چل اپنے گھر کا پتا بتا یا پھر
... کو فون کر کے بلا۔" فون کا چونگا پکڑے دوکاندار کو جیسے اس
...

نہیں ۔۔۔۔ نہیں میں باجی کو نہیں بلا سکتی۔ وہ تو بہت
... وہ کیا سوچیں گی۔" وہ گویا تڑپ کر بولی۔
چھوڑیں جی ۔۔۔ اس کی اسٹوریوں کو۔ آپ سیدھا سیدھا
... کو فون کریں۔" سیلز مین اکتا کر بولا۔
ٹھہریں ۔۔۔ یہ لڑکی چور نہیں۔ سامان کی رسیدیں میرے
... اس سے پہلے کہ دوکاندار پولیس کا نمبر ملاتا۔ سیڑھیاں
... میں نے بلند آواز میں کہا۔

جھمو کو گھر میں ملازمہ رکھنے کی ایک خاص وجہ تھی۔
... یہ تھا کہ گھر میں میرے اور دادو کے علاوہ کوئی نہ
... اماں ابا فوت ہو چکے تھے۔ ایک بڑا بھائی تھا۔ کے بعد
... اماں ابا کی موت نے اس پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ وہ چپ
... میں دوبئی چلا گیا۔ میری تعلیم پوری ہوئی تو میں نے
... کے سکول میں نوکری کر لی۔ بھائی کے دوبئی چلے جانے سے
... تھا۔ دادو میری شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ مگر
... چھوڑ دیتی۔ اور پھر ٹیچر بننا میرا بچپن کا خواب
... شوق پالتی رہتی۔ سو میں نے تو سوچا تھا
... ان کے بیاہ کروں گی۔ میرے پیسے دیکھوں
... کے ہے؟ لگتا ہے تو وہ باہر جا بسا ہے اور

یہ لڑکی مجھے کسی گنتی میں ہی نہیں رکھتی۔ اے اللہ تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے؟ میں تو مرنے کی دعا بھی نہیں مانگ سکتی۔"

دادو کا ڈھلیا دن بدن بڑھتا دیکھ کر میں نے جھمو کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ ہمارا محلہ سفید پوش لوگوں کا محلہ تھا اور ہمارے جیسے سفید پوش اور کچھ اچھے کھاتے پیتے گھروں سے آگے بند کی طرف ان خانہ بدوشوں کی آبادی تھی جو پہلے یہاں جھگیوں میں آکر آباد ہوئے تھے اور پھر آہستہ آہستہ ان جھگیوں نے چھوٹے چھوٹے کچے گھروں کی شکل لے لی تھی۔ اگرچہ یہ لوگ اب قریہ قریہ گھومنا چھوڑ چکے تھے لیکن ان کی عادات ابھی بھی نہیں بدلی تھیں۔ وہی گھروں میں پڑے جاہل نشہ باز مرد اور ارد گرد کی آبادیوں میں چوڑیاں بیچتی یا محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی عورتیں۔ ان لوگوں نے اپنے بچے بھی بڑی بڑی کوٹھیوں میں ملازم کروا رکھے تھے۔

جھمو سات آٹھ سال کی ایک دبلی پتلی سانولی سی بچی تھی۔ جب اس کی ماں اسے ہمارے ہمارے یہاں چھوڑنے آئی تو غربت اور فاقہ کشی ان کے انگ انگ سے ظاہر تھی۔ "بی بی مجھے اس کی تنخواہ کا اتنا لالچ نہیں۔ بس یہ ہے کہ کل کو جب یہ بڑی ہو گی تو اس کے بیاہ پر دان دہیز دینا آپ کی ذمہ داری ہو گا۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر دادو سے کہا تھا۔ "ہاں ۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔ ہم اسے اپنی بچی کی طرح رخصت کریں گے۔" بعد میں مجھے پتا چلا۔ ان لوگوں کی بچیاں شہر میں بڑی بڑی کوٹھیوں میں اسی شرط پر نوکر تھیں۔

بہرحال، جھمو دادو کے لئے ایک بہترین مشغلہ ثابت ہوئی۔ دادو اس عمر میں بھی گھر کا زیادہ تر کام کاج خود کرنا پسند کرتی تھیں۔ اب سارا دن جھمو کو بھی ساتھ لگائے رکھتیں۔ کام سے فارغ ہوتیں یا ان کی اپنی عبادت کا ٹائم ہوتا تو اسے بھی وضو کرا کر نماز سکھاتیں۔ سیپارہ پڑھانے لگتیں۔ اس کا شوق اور دلچسپی دیکھ کر میں نے اسے اردو کی ابتدائی کتابیں بھی دلا دی تھیں۔

"جھمو تجھے سکول پڑھنے کا شوق نہیں؟" میں نے پوچھا تھا۔ "شوق تو بڑا ہے جی۔ پر ابا بیمار رہتا ہے اور بہن بھائی چھوٹے ہیں۔ گھر کا خرچہ مجھے اور اماں کو ہی چلانا پڑتا ہے۔" اس نے جواب دیا تھا۔ "چل تو دادو سے پڑھا کر۔" میں نے کتابیں اسے تھماتے ہوئے کہا تھا اور اس کی آنکھوں میں جیسے خوشیوں کے ستارے سے

جاتے تھے۔

اور میں بہت خوش ہوتی تھی کہ میں ایک بہت بڑی نیکی کر رہی تھی۔ ایک ضرورت مند لڑکی کو علم کی روشنی سے نواز رہی تھی۔ خود بھی مجھے نیکی کے اپنے چھوٹے بڑے جا بجا جہاں بیٹھ کر مجھے سب لوگ بہت بھولے بھالے نظر آنے لگتے جو بالکل لیبر پہنچتے تھے وہ ان کے حق داروں میں رحم کا جذبہ بھی سر اٹھاتا ہی تھی۔ لوگ مجھے میں سکول میں میری تعریف کرتے تھے کہ باجی نے اپنی نوکرانی کو بھی گھر کے فرد کی طرح رکھا ہوا ہے۔ محلے کے دیگر گھروں میں کام کرنے والیاں اس پر رشک کرتیں۔ میں اس پر اور بھی عبادت کی ادائی کرتی۔ لیکن مجھے افسوس اس بات پر تھا کہ میں اس کے اندر کی بھوک کو ختم نہیں کر سکی تھی۔ حالانکہ دادو اسے وافر کھانا دیتی تھیں۔ جس میں سے تھوڑا بہت کھا کر وہ باقی شاپر میں ڈالتی۔ "میں گھر جا کر کھاؤں گی جی۔" وہ کہتی۔

"گھر لے جانے کے لئے اور لے لینا۔" دادو کہتیں۔ "آپ نے دیا جی ۔۔۔ میں کھاؤں گی۔" شام ڈھلے گھر جاتے ہوئے دادو اسے باقی بچا کھانا بھی سیٹ کر دے دیتیں لیکن اس کی نظر کھانے کی دیگچی سے نہ ہٹتی۔

میں اپنے کئی جوڑے چھوٹے کروا کر اسے دے دیتی۔ کئی بار نیا جوڑا بھی بنوا دیتی۔ مگر ہر کپڑا ایک دو بار ہی جمیمو کے تن پر نظر آتا پھر غائب ہو جاتا۔ "ارے جمیمو وہ نیا جوڑا کہاں گیا جو میں نے تجھے پچھلے ہفتے دیا تھا۔" میں اسے پرانا سا پھٹنے کا جوڑا پہنے دیکھ کر حیرت سے پوچھتی۔ "وہ جی میں نے کہا کام کاج میں خراب ہی ہو گا۔ اس لئے سنبھال دیا تھا۔" وہ سر جھکا کر کہتی۔ "پاگل خراب ہو جائے گا تو اور لے دوں گی تجھے۔" میں جھلاتی۔ "اچھا جی۔ کل پہن آؤں گی۔" مگر وہ کل کبھی نہ آتی۔ یہاں تک کہ اس کے حیلے سے گھبرا کر میں اسے کوئی اور جوڑا دے دیتی۔

"دادو مجھے لگتا ہے اس کا لالچ اور بھوکا پن کبھی ختم نہیں ہو گا۔" میں دادو سے کہتی۔

"بیٹی یہ فقیر لوگ فاقہ مست ہوتے ہیں۔ ان کو ایسے ہی رہنے کی عادت ہوتی ہے تو خوامخواہ بچ جاتی ہے۔" دادو مجھے سمجھاتیں۔ میں جو استاد تھی بچوں کی نفسیات سمجھنے کی دعویدار تھی۔ ان کو تہذیب سکھانے پر مصر تھی۔ ہر طرح کی عبادت کی ادائی کروانے پر بھی نہ اس بچی کو سمجھ سکی تھی۔ نہ اس کی بھوک چھڑوا پائی تھی۔

آج کل روزے چل رہے تھے۔ اس روز میں شاپنگ کے لئے شہر کی مارکیٹ جا رہی تھی۔ چل جمیمو تو بھی میرے ساتھ آج راشن بھی خریدنا تھا۔ مجھے پتہ تھا واپسی پر سامان زیادہ ہو گا وہ خوش ہو گئی۔ اسے بھی بازار میں گھومتے پھرتے بہت مزہ آتا تھا۔

ایک امپورٹڈ سٹور کے پاس سے گزرتے ہوئے شوکیس میں لگا ہوا ایک خوبصورت لباس مجھے اتنا اچھا لگا کہ اسے خریدنے کے لئے اندر جا پہنچی۔ قیمت بھی مناسب تھی۔ پیک کراتے ہوئے میں نے دیکھا۔ جمیمو بھی دوکان میں لگے ایک ڈریس کو بہت شوق سے دیکھ رہی تھی۔ گلابی رنگ کا تتلی کے پروں جیسے کپڑے کا بنا ہوا ایک خوبصورت فراک تو خاص طور پر اس کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ "یہ فراک اگر جمیمو پہنے تو کتنی اچھی لگے گی۔ اور ۔۔۔ اور میری نیکی اور غریب پروری کی کتنی دھوم مچے۔" ایک خیال میرے دل میں ابھرا۔ فراک کافی مہنگا تھا لیکن اپنی واہ واہ کروانے کے شوق میں، میں نے نہ صرف فراک بلکہ میچنگ جوتے، کلپس اور جیولری بھی خرید ڈالی۔ فراک خرید کر میں بہت خوش تھی۔ اس لئے نہیں کہ میں نے کوئی بڑی نیکی کی تھی بلکہ اس لئے کہ محلے میں میری بہت تعریف ہونے والی تھی۔ بھلا آج کے دور میں ان دو ٹکے کے نوکروں پر کون اتنا مہربان ہوتا ہے۔ میں غرور سے سوچ رہی تھی۔ اپنی چیزوں والا شاپر پکڑ کر جمیمو کا چہرہ بھی خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ اس روز ستائیسواں روزہ تھا۔ ساری رات عبادت میں جمیمو بھی میرے اور دادو کے ساتھ جاگی تھی۔ صبح دادو نے اسے سونے کے لیے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ "میں یہ سامان بھی ۔۔۔ ساتھ لے جاؤں جی۔" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ لے جا۔" نیند سے میرا برا حال تھا۔

ظہر کی نماز کے وقت میری آنکھ کھلی۔ نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر مجھے خیال آیا کہ کل میری کچھ شاپنگ ادھوری رہ گئی تھی۔ ویسے بھی روزے کو بہلانے کے لئے بازار

...چیک کر کے بہتر تھا جس ڈیپارٹمنٹل سٹور سے میں نے ... پہلے میں نے عید کا لباس خریدا تھا۔ آج وہیں سے مجھے ... چیزیں لینا تھیں۔ سو میں سیدھی اس سٹور پر پہنچی تھی۔

"یہ لڑکی چور نہیں ہے۔ اس کے سامان کی رسیدیں میرے ... ہیں" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میں بھی کہوں۔ یہ بچی دیکھی دیکھی کیوں لگ رہی ہے۔ ...آپ کے ساتھ ہی تو آئی تھی۔" ایک سیلز مین آگے آ کر بولا۔ کاؤنٹر پر جا کر میں نے ایک روز پہلے خریدے ہوئے سامان کی رسیدیں اپنے پرس سے نکال کر چیک کرائیں۔ تب سامان کا بل لے ... دکاندار بار بار مجھ سے معافی مانگ رہا تھا۔ "باجی آپ ہی کی خریدا ہوا سامان بغیر رسیدوں کے آج دوکان پر لانے کی ضرورت کیا تھی؟ ہم تو یہی سمجھے کہ اس نے ابھی اٹھایا ہے۔"

"میری غلطی یہ ہے کہ میں یہ سامان باجی کو بتائے بغیر آپ کو واپس کرنا چاہتی تھی۔" جمیمو جو مجرم بنی ایک طرف کھڑی تھی، اچانک سسک کر بولی۔ "مجھے اس خوبصورت فراک سے زیادہ ___ پیسوں کی ضرورت تھی۔"

"جمیمو! مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ تو نے میرے تحفے کی یہ عزت کی؟ سچ ہے کتے کو کھیر نہیں پچتی۔ مجھے لگتا ہے تو پہلے بھی میرے دیئے کپڑے بیچتی ہی رہی ہے، جو آج یہ جوڑا بیچ کر پیسے لینے آ پہنچی ہے۔ ابھی چار دن پہلے ہی تو تجھے دو سوٹ ... ہیں۔" میں نے بے حد تلخی سے کہا۔

"باجی! پہلے آپ کے دیئے ہوئے کپڑے میری بہنوں کے تن ڈھکتے رہے ہیں۔ اور پھر تن تو پرانے کپڑوں سے بھی ڈھکا جا سکتا ہے۔ لیکن بیمار ماں باپ کو دوا کے لئے روانہ ہو اور چھوٹے بہن بھائی بھوک سے بلک رہے ہوں تو آپ ہی بتایئے عید کے روز جمیمو اس نئے پروں جیسے لباس میں کیسی لگے گی؟" جمیمو نے میرے قدموں میں بیٹھ کر بلک کر پوچھا۔ مجھے یوں لگا جیسے سٹور میں رکھی قیمتی چیزیں میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔ ہنس رہی ہیں مجھ پر۔ جمیمو کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

☆☆☆☆

اقوال حضرت عثمان غنیؓ

- ★ اے انسان! خدا نے تجھے اپنے لیے پیدا کیا، تو دوسروں کا نہ بن۔
- ★ خدا سے سوداگری کرو، خوب نفع کماؤ گے۔
- ★ تلوار کا وار جسم کو زخمی کرتا ہے اور بری بات روح کو گھائل کرتی ہے۔
- ★ سب سے بڑا خطاکار وہ ہے جو لوگوں کی برائیاں بیان کرتا ہے۔
- ★ وہ علم جس کی آڑ میں دنیا کمائی جائے، بہت برا ہے۔

خاص بچے

یہ معذور سمجھے گئے، خاص ہیں
سراپا محبت ہیں، اخلاص ہیں

یہ شیدا ہیں قائد کے افکار کے
یہ پیکر ہیں، عزم اور کردار کے

یہ تابندہ سورج ہیں اس دور میں
نہیں ان کا پرتو کسی اور میں

عزیمت کی شمعیں جلاتے ہیں یہ
اندھیروں سے سب کو بچاتے ہیں یہ

یہ سچے ہیں، اچھے ہیں اور نیک ہیں
ارادوں کے پکے ہیں، سب ایک ہیں

کریں دستگیری جو اہلِ نظر
تو یہ خاص بچے ہوں مثلِ گہر

یہ ہر گام آگے ہی آگے بڑھیں
دعا ہے یہی خوب پھولیں، پھلیں

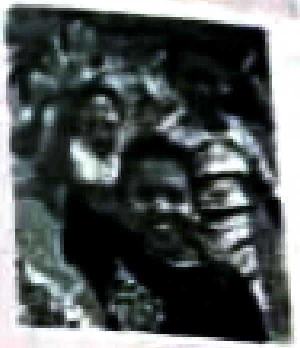

[illegible]

شیدا: چاہنے والا، تقلید کرنے والا۔ | پرتو: [illegible]
پیکر: جسم، شکل و صورت۔ | گہر: موتی، [illegible]
عزیمت: عزم۔ | گام: قدم۔

سات سال کی جان

دو بھائی پردیس گئے۔ ایک غریب تھا دوسرا امیر۔ دونوں کے پاس ایک ایک سواری تھی۔ غریب کے پاس گھوڑی اور امیر کے پاس گاڑی۔ چلتے چلتے رات ہو گئی۔ دونوں ایک جگہ ٹھہر گئے۔

رات کو غریب کی گھوڑی نے بچھیرا دیا۔ بچھیرا لڑھک کر گاڑی کے نیچے آ گیا۔ سویرا ہوتے ہی امیر بھائی نے اپنے بھائی کو جگایا اور کہا:

"اٹھو بھیا میری گاڑی کے رات بچھیرا ہوا ہے۔"

غریب اٹھ گیا اور بولا "بھلا گاڑی کے بھی کہیں بچھیرا ہوتا ہے۔ یہ تو میری گھوڑی کا معلوم ہوتا ہے۔"

"اگر اس کا ہوتا تو اسی کے پاس ہوتا" امیر بھائی نے کہا۔

دونوں میں جھگڑا ہوا۔ بات کچہری تک پہنچی۔ امیر بھائی نے گواہوں کو رشوت دے کر اپنی طرف کر لیا۔ بے چارے غریب کے پاس سچ کے سوا کچھ نہ تھا۔

ہوتے ہوتے معاملہ بادشاہ زار کے پاس پہنچا۔ زار نے دونوں کو بلایا اور چار پہیلیاں اُن سے بُجھوائیں۔ اُس نے پوچھا:

"دنیا میں سب سے طاقت ور اور تیز، سب سے موٹی، سب سے نرم، سب سے پیاری چیز دنیا میں کون سی ہے؟"

زار نے انہیں سوچنے کے لیے تین دن کی مہلت دی۔

اس نے کہا "پھر مجھے دن آؤ اور مجھے اپنے جواب بتاؤ۔"

امیر بھائی بھی دیر سوچتا رہا تب اسے اپنی ایک رشتے دار عورت یاد آئی اور وہ اس سے پوچھنے کے لیے چل پڑا۔

جب وہ عورت کے یہاں پہنچا تو اس نے پیار سے لے خلایا خوب آؤ بھگت کی پھر پوچھا "تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

"زار نے مجھ سے چار پہیلیاں پوچھی ہیں اور تین دن کی مہلت دی ہے۔" امیر بھائی بولا۔

"اچھا تو بتاؤ کیا پہیلیاں ہیں؟"

"پہلی پہیلی یہ ہے کہ دنیا میں سب سے طاقت ور اور تیز کون سی چیز ہے؟"

"واہ یہ تو میرے شوہر کی گھوڑی ہے۔ اس سے زیادہ طاقتور اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ ذرا چابک کا اشارہ ہوا اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔"

"اچھا دوسری پہیلی یہ ہے: دنیا میں سب سے موٹی چیز کون سی ہے؟"

"واہ یہ تو ہمارا سانڈ ہے۔ وہ اتنا موٹا ہے کہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔"

"تیسری پہیلی یہ ہے: دنیا میں سب سے نرم چیز کون سی ہے؟"

"واہ یہ تو میرا پروں والا بستر ہے۔ میں نے خواب میں بھی اس سے نرم چیز کوئی نہیں دیکھی۔"

"خیر آخری پہیلی یہ ہے: دنیا میں سب سے پیاری چیز کون سی ہے؟"

"میرا پوتا ایوانوشکا اس سے بڑھ کر پیارا کون ہو سکتا ہے بھلا۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے نیک بی بی۔ میں اب سمجھ گیا کہ مجھے بادشاہ کو کیا بتانا چاہیے" امیر بھائی نے کہا۔

اب بے چارے غریب بھائی کی سنو۔ وہ روتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ دروازے پر اسے اپنی سات سال کی بچی ملی۔ وہی اس کا کل خاندان تھا۔ اس سات سال کی بچی نے کہا:

"بابا تم پھوٹ پھوٹ کر کیوں رو رہے ہو؟"

"روؤں نہ تو کیا کروں؟ زار نے مجھ سے چار پہیلیاں پوچھی ہیں اور میں اُن کا جواب زندگی بھر نہیں دے سکتا۔"

”مجھے یہ بتاؤ کہ ... کیا ہیں؟“ ... نے پوچھا

پہلے تو سب سے ... اور سب سے ... سوال

سب سے زرخیز، سب سے ... اور سب سے ... کون سی ہے؟“

پھر کچھ دیر ... اور کہ وہ سب سے طاقتور ... اور

چیز ... سب سے ... زمین ہے کیونکہ جو بیج

بویا جاتا ہے ... پیدا ہوتی ہیں۔ ان سب کو ... کھلاتی

پلاتی ہے۔ سب سے ... کیونکہ ... چاہے جس چیز

پر بھی ... رکھتا ہے اور دنیا میں

سب سے میٹھی نیند ہے۔“

تب دونوں بھائی زار کے پاس پہنچے۔ زار نے ان کی بات

سنی۔ پھر اس نے غریب سے پوچھا

”یہ جواب تم نے خود سوچے ہیں یا کسی نے تمہیں بتائے ہیں؟“

”حضور، میری ایک بیٹی ہے، سات سال کی۔ اس نے مجھے یہ جواب بتائے ہیں۔“

بادشاہ نے کہا ”اگر تمہاری بیٹی اتنی ہی عقل مند ہے تو یہ تھوڑا سا ریشم لے جاؤ اور اس سے کہو کہ میرے لیے ایک بڑھیا سا تولیہ کل صبح تک بن دے۔“

غریب نے ریشم لیا اور پریشان و اداس گھر پہنچا۔

”بڑی آفت آئی ہے، میری بیٹی“ اس نے کہا ”زار کا حکم ہے کہ تم اس ریشم کا ایک تولیہ اس کے لیے بن دو۔“

”گھبراؤ مت بابا“ بیٹی نے کہا۔ پھر اس نے جھاڑو کی ایک تیلی توڑ کر اپنے باپ کو دی اور کہا ”اسے زار کے پاس لے جاؤ اور کہو کہ کوئی ایسا کاریگر ڈھونڈ دے جو اس تیلی سے ایک کھڈی بنا دے۔ اس کھڈی پر میں تولیہ بن دوں گی۔“

غریب آدمی زار کے پاس پہنچا اور اپنی بیٹی کی بات کہہ سنائی۔ جب زار نے اسے ایک سو پچاس انڈے دیے اور کہا:

”یہ 150 انڈے اپنی لڑکی کو دو اور کہو کہ کل صبح تک ان میں سے 150 بچے نکل آئیں۔“

وہ بے چارہ گھر آیا اور بیٹی سے کہا ”او میری بیٹی! ایک بلا گئی تو دوسری آئی۔“ یہ کہہ کر اس نے ساری بات کہہ سنائی۔

”گھبراؤ مت بابا“ بیٹی نے کہا ”میں ابھی اس کا انتظام کرتی ہوں۔“

بیٹی نے سارے انڈے پکا کر دوپہر اور رات کے کھانے کے لیے رکھ دیے۔ پھر اس نے باپ سے کہا ”زار کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ مرغی کے بچوں کے کھانے کے لیے باجرہ چاہیے لیکن وہ ایسا ہو کہ جو بویا جائے، باجرہ پیدا ہو جائے، کاٹا اور صاف کیا جائے سب کچھ ایک دن کے اندر ہو جائے۔ نہیں تو بچے بھوکوں مر جائیں گے۔“

زار نے غریب آدمی کی پوری بات سنی اور کہا

”اگر تمہاری بیٹی اتنی ہی عقل والی ہے تو اس سے کہو کل صبح یہاں ایسے آئے کہ نہ پیدل ہو، نہ گھوڑے پر سوار، نہ ساتھ تحفہ لائے اور نہ خالی ہاتھ آئے۔“

غریب آدمی نے سوچا ”یہ کام تو میری بیٹی کے بس کا نہیں۔ اب تو آفت آئی کہ آئی۔“

لیکن سات سال کی بیٹی نے کہا ”گھبراؤ مت بابا۔ شکاریوں کے پاس جاؤ اور میرے لیے ایک زندہ خرگوش اور ایک تیتر خرید لاؤ۔“

غریب آدمی ایک شکاری کے پاس گیا اور اس سے ایک خرگوش اور ایک تیتر خرید لایا۔

دوسرے روز صبح سویرے اس کی بیٹی نے تیتر ہاتھ میں لیا اور خرگوش کی پیٹھ پر سوار ہو کر محل کی طرف چل پڑی۔

زار اسے محل کے پھاٹک پر ملا۔ لڑکی نے جھک کر سلام کیا اور کہا ”حضور، یہ آپ کے لیے تحفہ ہے“ اس نے تیتر اس کی طرف بڑھایا۔ زار اسے پکڑنے ہی والا تھا کہ وہ پھر سے یہ جا وہ جا۔

”بہت خوب!“ زار نے کہا ”تم نے ٹھیک ویسے ہی کیا جیسا میرا حکم تھا۔ اچھا اب یہ بتاؤ میں جانتا ہوں کہ تمہارا باپ غریب ہے۔ وہ تمہارے کھانے کا کیا بندوبست کرتا ہے؟“

”میرا باپ سوکھی زمین پر مچھلیاں پکڑتا ہے اور میں ان کا مزے دار سالن پکاتی ہوں۔“

بادشاہ بولا ”دور ہو، بے وقوف لڑکی! بھلا کہیں خشک زمین پر بھی مچھلیاں ہوتی ہیں؟ مچھلیاں تو پانی میں رہتی ہیں۔“

”اور آپ تو عقل مند آدمی ہیں، حضور۔ آپ نے کسی گاڑی کے بچھیرا ہوتا دیکھا ہے؟“

اس پر زار لاجواب ہو گیا اور اس نے بچھیرا غریب آدمی کو دلوا دیا۔

سوالوں کے صحیح جواب بھیجئے اور 450 روپے کی کتابیں جیتئے

ایک سے زائد اور سات سے کم حل موصول ہونے کی صورت میں انعام مساوی مالیت میں دیئے جائیں گے۔ سات یا سات سے زیادہ حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا اور چھ انعام بالترتیب 100، 90، 80، 70، 60 اور 50 روپے کی مالیت کی کتابوں کے دیئے جائیں گے۔

1. حضرت نوحؑ کی کشتی کس پہاڑ پر جا کر رکی تھی؟
2. امام الانبیاء کس کا لقب ہے؟
3. شہنشاہ اورنگ زیب نے کتنے برس حکومت کی؟
4. ماؤنٹ ایورسٹ کی اونچائی بتائیں؟
5. نیاگرا آبشار کہاں واقع ہے؟
6. دنیا کے سب سے بڑے درخت کہاں پائے جاتے ہیں؟
7. سورج کا زمین سے فاصلہ کتنا ہے؟
8. ولی مون عکسر کہاں واقع ہے؟
9. اسلام آباد کب پاکستان کا دارالحکومت بنا؟
10. سب سے زیادہ سنچریاں کس پاکستانی کھلاڑی نے بنائی ہیں؟

جوابات علمی آزمائش اکتوبر 2006ء

1- سنتر اور دالاؤکا۔ 2- 4 سال 9 ماہ۔ 3- کوالالمپور۔ 4- دہلی (کلاکت) میں۔ 5- افریقہ میں۔ 6- تھامس ایڈیسن۔ 7- شنگھائی۔ 8- اردن کے قریب۔ 9- تبت کو۔ 10- حنیف محمد۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے بالکل درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 6 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیئے جا رہے ہیں۔

☆ پہلا انعام: نورہ آصف، گوجرانوالہ
☆ دوسرا انعام: حمزہ شعیب، لاہور
☆ تیسرا انعام: یاسر سعادت، حیدرآباد
☆ چوتھا انعام: حرا احسان، کراچی
☆ پانچواں انعام: عمران احمد، میرپور خاص
☆ چھٹا انعام: ماریہ جاوید چوہدری، اوکاڑہ

ان ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کیے جا رہے ہیں۔

عادل مسعود لاہور۔ علی شیرو ملتان۔ عمیر رضا راولپنڈی۔ حسن عسکری اوکاڑہ۔ ندرت پروین سرگودھا۔ عاصمہ ممتاز نوشاب۔ وسیم صدیقی رینہ۔ کامل علی منظوری لاہور۔ شعیب حسن ملتان۔ ادریس قریشی منڈی بہاؤالدین۔ علی رشتی بہاولنگر۔ محمد یونس اوکاڑہ۔ سرور ہاشم ترین ایبٹ آباد۔ تذیر حسین شیخوپورہ۔ ملک عادل حنیف لاہور۔ سعدی صدیقی لاہور۔ شذیہ عارف لاہور۔ شہباز احمد شرقپور۔ احسن طارق لیہ۔ محبوب علی خان گڑھ۔ زاہد علی بھٹی راولپنڈی۔ جواد احمد ٹیکسلا۔ مدحت علی لالہ موسیٰ۔ آفتاب احمد خان چھچھ۔ عالیہ فرشد کراچی۔ صائمہ صوفی لاہور۔ شاہدہ سلیم گوجر خان۔ زاہد بٹ گوجرانوالہ۔ سلیم احمد وزیر آباد۔ عدیلہ منور لاہور۔ سیدہ کوثر پروین لیہ۔ حسن ثاقب ساہیوال۔ علینہ اشرف لاہور۔ زبیدہ جلال لاہور۔ شمس خالد گوجرانوالہ۔ ذکیہ ڈار لاہور۔ عاصیہ جیلانی لاہور۔ مظہر علی حیدرآباد۔ غلام رسول لاہور۔ رمضان علی لاہور۔ سرور صدیقی راولپنڈی۔ فرقان احمد لاہور۔ کاشف بھٹی ملتان۔ توقیر میر ٹیکسلا۔ سلیم جواد حسن ابدال۔ عثمان وزیر واہ کینٹ۔ شاہد طفیل لاہور۔ ساجد حسین ملتان۔ جمیلہ صدیقی بہاولپور۔ عابدہ نصرت کراچی۔ عاصم طور فیصل آباد۔ سید ذیشان حیدر کراچی۔ صفدر بلوچ لاہور۔ عارف شاہ نقی بھکر۔ افضل حیدر بھلوال۔ ممتاز ملک لاہور۔ راشد قریشی میاں چنوں۔ عامر بھٹی لاہور۔ خالد اکبر صدیقی راولپنڈی۔ روقیہ ادریس لاہور۔ امبرین سعید لاہور۔ زین عارف فیصل آباد۔ عبدالاحد ظہیر لاہور۔ عبدالحسین اعجاز لاہور۔ عدیل سلیم کسووال۔ انعام اللہ شیخوپورہ۔ بلال اقبال گوجرانوالہ۔ سمیع اللہ فیروز والا۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 نومبر 2006ء

دماغ لڑاؤ

نام: ____________

مقام: ____________

پتہ: ____________

گاجر کا حلوہ، چھوٹے نانا اور.....

آج چھٹی کا دن ہے۔ گھر میں صبح ہی سے بڑی گہما گہمی اور چہل پہل ہے۔ چھٹی کے روز اسی طرح گہما گہمی ہوتی ہے۔ گھر میں سب لوگ جو ہوتے ہیں۔ مگر آج کے دن کی خاص بات گاجر کا حلوہ خاص اہتمام سے بنایا جاتا ہے اور جب بنتا ہے تو کئی کلو۔ پہلے جب مٹھائیاں اتنی عام نہیں تھیں تو چھوٹی پھو اور رمضان بابا گاجریں چھیل کے کدو کش کرتے تھے۔ امی، بڑی دادی، پھوپھی یا جو بھی موجود ہو ان کی مدد کرتے تھے اور پھر بڑی اماں اپنے ہاتھوں سے لذیذ گاجر کا حلوہ تیار کرتی تھیں۔ اس میں بادام اور کھویا بھی ڈالا جاتا اور اتنا بھونا جاتا کہ محلے کے کئی گھروں میں اس کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیل جاتی۔ اور پھر یہ حلوہ محلے والوں کے یہاں بھی بڑے خاص اہتمام سے تھالی میں سجا کے بھیجا جاتا۔

گاجر کا حلوہ یوں تو سب ہی کا پسندیدہ تھا مگر میرے چھوٹے نانا تو اس کے بے حد رسیا تھے۔ انہیں گاجر کا حلوہ اس قدر پسند تھا کہ اگر سامنے ہو تو پھر انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی کہ ابھی تو کھانا بھی کھانا باقی ہے۔ پہلے تو اس وہ گاجر کا حلوہ کھاتے ہی

گھیر لیتے تھے۔

میں بہت چھوٹا سا تھا جب چھوٹے نانا لاپتہ ہو گئے۔ کہنے کو تو وہ ہندوستان گئے تھے کہ اپنے آبا و اجداد کے گھروں پر جائیں گے جہاں ان کا بچپن بھی گزرا تھا۔ تاج محل کا نظارہ کریں گے، حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کی زیارت کریں گے۔ سیر و تفریح کریں گے اور پھر واپس آ جائیں گے مگر ہندوستان جاتے ہی ان کا کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ پورے بارہ سال گزر گئے ہیں اور کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے۔ ہر طریقے سے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ رشتہ داروں، احباب کو سب ہی کو خطوط لکھے لیکن ان کا آج تک کچھ پتہ نہ چلا۔ اس غم میں بڑی اماں گھل سی گئیں۔ انہیں اپنے چھوٹے نانا کے زندہ ہونے کی امید بھی کم تھی لیکن وہ دعائیں مانگے جاتی تھیں کہ شاید قبول ہو جائیں۔

میرے دادا اور نانا آپس میں سگے بھائی ہیں۔ ہم سب مل کر ایک گھر میں رہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی سی حویلی ہے جس میں دو منزلیں ہیں۔ ایک منزل پر دادا اور دوسری پر نانا اپنے اپنے بچوں اور ان کے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ بڑی اماں گاجر کا حلوہ بڑی بہت شوق سے اور محبت سے بناتی ہیں مگر جب بناتی ہیں تو کبھی آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر ایک آہ سی ان کے لبوں سے نکل جاتی ہے۔ اکثر چھوٹے نانا کا نام ہے۔ چھوٹے نانا بڑی اماں کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ بڑی ان سے زیادہ نہیں تھے اس لیے ان میں دوستی بھی بہت تھی۔ اپنے والدین کے انتقال کے بعد بڑی اماں نے ہی انہیں اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ میں چار پانچ سال کا تھا جب چھوٹے نانا ہم بچوں

سے بڑا پیار کرتے تھے۔ ہمارے لیے مزے مزے کے چاکلیٹ، ٹافیاں
اور بسکٹ لاتے اور ہمارے ساتھ کھیلتے۔ بڑوں میں بڑے اور بچوں
میں بچے بن جاتے۔ ابی کے ساتھ ان کا رشتہ ماموں کا نہیں بلکہ
بھائیوں اور دوست کا تھا۔ ایک دن گھر میں کھانے کی دعوت تھی۔
سب نے نانی سے گاجر کا حلوہ بنانے کی فرمائش کی جو انہوں نے
پوری کی۔ "تو دیکھنا ذرا ذائقہ کیسا بنا ہے؟" نانی نے ابی کو حلوہ کھاتے
ہوئے پوچھا۔ "آج اظہر کی بہت یاد آ رہی ہے۔" "ہاں بس اب
بالکل ٹھیک ہے۔" ابی نے سر ہلا کے جھٹکتے ہوئے چھوٹے ماما کے
ذکر کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

چونکہ رات بہت ہو گئی تھی اس لیے نانی نے حلوہ فریج میں
رکھوا دیا تاکہ اگلے دن صبح محلے میں بھجوا دیں گی۔ صبح ہوئی۔ نانی اماں
نماز پڑھ کے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ رفیق چائے لے کر آیا لیکن
گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ "بیگم صاحب — بیگم صاحب — وہ جی
حلوے والی قاب حلوہ نہیں ہے۔" "کیا مطلب؟" نانی ہکا بکا رہ
گئیں۔ "مطلب کہ حلوے کی قاب۔" وہ بولیں۔ "بس خالی قاب صحن
میں پڑی ہے۔" نانی اماں اٹھتے
ہوئے بولیں "کتے نہ لے گئے ہوں۔"
"صحن میں تخت پر خالی
قاب پڑی تھی۔ "ہائیں" رفیق
بھی چونک کے بولا "بیگم
صاحب — مجھے لگتا ہے یہاں
کوئی بھوت ہے۔ ان کو میٹھا بہت
پسند ہوتا ہے۔" "ہ — ہ
نہیں — ابھی میں جب
آپ کو بلانے گیا تو ایک گلاس
یہاں رکھا ہوا تھا اب وہ بھی
غائب ہے۔" "کیا بکتا ہے؟"
اور ابی بھی آوازیں سن کر
باہر نکل آئے۔ رفیق
نے ساری کہانی سنائی کہ کس
طرح حلوے کی قاب غائب ہو

گئی۔ "مجھے بھی اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔" ابو
بولے "کسی بچے کی شرارت ہو گی۔" "صاحب جی — بچے تو ادھر
کوئی نہیں ہے اس وقت۔" رفیق بولا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا "کیوں
بابو صاحب۔" "ہاں وہ سب اپنے اپنے کمروں میں ہیں۔" میں نے
جواب دیا۔ مجھے "نانی کی لرزتی ہوئی سی آواز گونجی۔ "اگر یہ سب
بارہ چودہ سال ادھر ہوا ہوتا تو میں کہتی بھلا اظہر میاں کے علاوہ اور
کون ہو سکتا ہے۔" چھوٹے ماما کے ذکر کے ساتھ ہی فضا میں افسردگی
سی پھیلنے لگی جو زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ "ارے بس رہنے دو میاں!!"
رمضان بابا جو اب خاصے بوڑھے ہو چکے تھے اپنے کوارٹر میں جاتے
ہوئے بڑبڑائے "پتہ نہیں کہاں کی ہانک رہے ہو۔" رکھی نہیں
ہو گی اور ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو غائب ہونے کا۔" "ارے — یہ
کون ہے — " یہ چند الفاظ بے ساختہ حیرت ان کے منہ سے نکلے۔
کوارٹر کے کھلے دروازے سے کوئی اندر بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ سب
لوگ ادھر دیکھنے لگے۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس کے ایک ہاتھ میں چمچ اور
دوسرے میں گلاس تھا جبکہ سامنے میز پر قاب رکھی ہوئی تھی اور

اس کی ہچکیاں ہم سب پر بھاری تھیں۔ ہم گھبرا کے کھڑے ہو گئے۔ پھر جلدی کا سوال تھا جو ہم نے پوچھ لیا۔ بھیا ۔۔۔ دیکھو ۔۔۔ سفید پوش ۔۔۔ اس کی دوسرے دوست ہو گا ہے۔ سفید پوش شخص جس کے ساتھ ہمارا بوڑھا تھا اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور وہ بوڑھا اور ہمارا دکھائی دے رہا تھا وہ ساکت و جامد ہمیں ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

ہم سب حیرت سے اس سفید پوش کو دیکھ کر حیران پریشان سے کھڑے تھے کہ یکایک خالہ جی کی لرزتی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ "تم ۔۔۔" یہ کہتے ہوئے وہ بوڑھے کی طرف بڑھیں۔ "اظفر ۔۔۔ اظفر ۔۔۔ تم میرے اظفر ہو نا ۔۔۔" ہم سب ہونقوں کی طرح کھڑے تھے۔ "امی آپ کو کیا ہو گیا ہے۔" ہم نے آگے بڑھ کے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی سفید پوش نے لپک کر آگے بڑھ کر خالہ جی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "آپا ۔۔۔ آپا ۔۔۔" اس کی روتی ہوئی آواز ہم سب کے کانوں سے ٹکرائی۔ ہم سب سن سے کھڑے تھے۔ لگتا تھا زمین نے پیروں کو جکڑ لیا ہے۔ "اظفر ۔۔۔ میرے بھائی ۔۔۔ میرے بیٹے ۔۔۔" خالہ جی بے قراری سے روتے ہوئے بار بار اس کی پیشانی اور چہرہ چوم رہی تھیں۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ واقعی وہ چھوٹے نانا ہی تھے۔ یہ سب کچھ ایک خواب کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔

پھر تھکی تھکی سی خالہ جی چھوٹے نانا کو گلے لگائے روتی رہیں۔ "دیکھا میں نے کہا تھا میرا اظفر زندہ ہے ۔۔۔" وہ بار بار کہتیں۔ سب گھر والے ان کے گرد جمع تھے اور اس ڈرامائی ملاقات کو بڑی دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پھر سب باری باری چھوٹے نانا سے ملنے لگے۔ رہا شیخ تو وہ اپنی جگہ پہ گڑا یہ سارا تماشہ انتہائی حیرت کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ جب جذباتی لمحے گزر گئے تو سب چھوٹے نانا کو لے کر اندر آ گئے۔ "ہاں تو میاں اب بتاؤ کہ کہاں رہے؟" نانا نے چھوٹے نانا سے وہ سوال کیا جس کا جواب سننے کو ہم سب بے قرار تھے۔ "کیا بتاؤں" چھوٹے نانا بولے۔ وہ اب بھی خالہ جی کے پہلو سے لگ لگائے بیٹھے تھے۔ خالہ جی نے انہیں ماں بن کے پالا تھا اور ایک ماں ہی کی طرح ان سے محبت کرتی تھیں۔ "یہاں سے تو یہ سوچ کے ہندوستان گیا تھا کہ وہاں گھوم پھر کے مل ملا کے آ جاؤں مگر بد قسمتی نے ایسا کھیل کھیلا کہ سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ بھری دوپہر تھی کہ ایک دن دلی میں گھوم پھر رہا تھا کہ پولیس نے مجھے ناکردہ گناہوں کے جرم میں دھر لیا۔ مجھ پر جاسوسی، دہشت گردی اور نجانے کیا کیا الزامات لگانے لگے۔ کن کن ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنا پڑی۔" چھوٹے نانا رو رہے تھے اور ان کے ساتھ ہم سب کے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ واقعی چھوٹے نانا بالکل ہی مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ سوکھ کے کانٹا ہو گئے تھے، گال پچک گئے تھے، رنگ جھلس گیا تھا۔ اپنی عمر سے کم از کم دس پندرہ سال بڑے لگ رہے تھے۔ چہرے پہ جابجا لگے ان چوٹوں کے نشانات ان کے ساتھ گزرے ہوئے ظلم کی داستان سنا رہے تھے۔ "جب ان لوگوں کو پورا یقین ہو گیا کہ میرا کسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں تو قیدیوں کے تبادلے کے تحت قیدیوں کے جتھے میں مجھے بھی چھوڑ دیا گیا۔" ہم سب دم سادھے ان کی داستان سن رہے تھے اور خالہ جی "میرا اظفر ۔۔۔ میرا اظفر" کہتے ہوئے ان کا لاڈ کر رہی تھیں۔ "مگر میاں اظفر" نانا بولے "یہ تمہیں کیا سوجھی ..... یہاں اتنے عرصے بعد گھر آئے ہو۔ بجائے اس کے کہ ہمارے پاس آتے یہ چوروں کی طرح گاجر کا حلوہ کھانے بیٹھ گئے۔" "یہ بھی آپ نے خوب کہا بھائی صاحب" چھوٹے نانا بولے "جب میں آیا تو باہر کا دروازہ کھلا تھا اور پورا گھر سو رہا تھا۔ سوچا تو یہی تھا کہ سرپرائز دوں گا مگر بھوک بہت لگ رہی تھی۔ فرج کھولا تو گاجر کا حلوہ دیکھا، بس مجھے اور کیا چاہیے تھا۔"

"نہیں بھئی ایسا لگتا ہے گاجر کے حلوے کی خوشبو تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔" نانا نے کہا اور ہم سب ہنس پڑے۔

یہ دنیا مقابلے کی دنیا ہے،
اگر آپ دوسروں سے آگے نہیں بڑھتے تو
دوسرے آپ سے آگے بڑھ جائیں گے!

کرنے والے جھٹ اپنا کام آج کے دن کرتے ہیں
اور نہ کرنے والے جھٹ اپنا کام کل کے دن!

حیران کن

سید شوکت اعجاز

کسی بھی زبان کی گرامر یا ڈکشنری اہل زبان ہی بہتر طور پر لکھ سکتا ہے۔ مگر 1530ء میں پہلی فرانسیسی گرامر لکھنے والا شخص فرانسیسی نہیں بلکہ انگریز تھا۔ جان پال گریو فرانسیسی زبان کا ماہر اور عالم تھا جس نے اس معاملے میں فرانس والوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

خطرہ پل

براعظم افریقہ کے "بم ہل" نامی دریا پر ایک عجیب و غریب پل موجود ہے جو کہ بڑے بڑے تناور درختوں کو کاٹ کر تکون نما شاخوں پر ٹکا دیا گیا ہے۔ ان تنوں کے درمیان بھی کئی گز کا فاصلہ ہے جو مسافر چھلانگ لگا کر عبور کرتے ہیں اور اس طرح کئی مسافر گر کر طوفانی لہروں کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔

پتوں کا جال

جزائر تاہیتی واقع بحرالکاہل میں مچھیرے پام کے درخت کے پتوں کو بطور جال استعمال میں لاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے بڑے بڑے پتوں کو جال نما شکل میں لا کر سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ جس سے بے شمار مچھلیاں اس میں پھنس جاتی ہیں جنہیں مچھیرے آسانی سے کھینچ لیتے ہیں۔

انوکھی شناخت

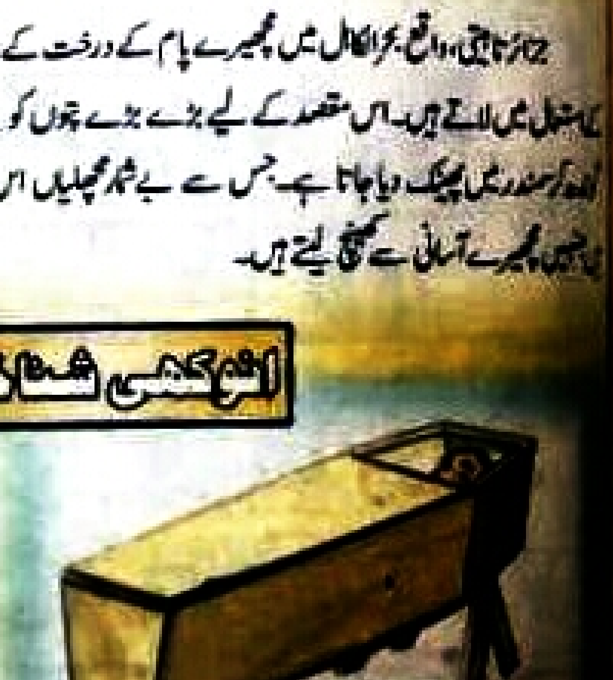

برطانیہ میں ایک کتے نے اپنے مالک کی لاش کو پہچان کر گمنام مجرم کی شناخت کروا دی۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک چور گھر میں نقب لگاتا ہوا صاحب خانہ کی فائرنگ سے ہلاک ہو گیا۔ مقامی پولیس اور لوگ اسے شناخت نہ کر سکے۔ آخر کار اسے تابوت میں بند کر کے رکھ دیا گیا تا کہ اس کے وارثوں کا پتا لگایا جا سکے۔ چند دنوں کے بعد ایک کتا نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ اس نے تابوت کے گرد چکر لگایا اور جونہی اس نے لاش کا چہرہ دیکھا تو وہیں بیٹھ گیا اور تابوت چاٹنے لگا۔ اس طرح اس شخص کو کتے کی معرفت پہچان لیا گیا اور اس کے لواحقین تک رسائی ہو گئی۔

ڈاکٹر جوزف ایک انتہائی قابل صاحب علم، دانشور اور بلند پایہ ماہر آثار قدیمہ تھے۔ عمر کا ایک طویل دور انہوں نے قدیم مصر کے بچے کھچے کھنڈرات اور عراق میں مصری تہذیب کی گمشدہ تاریخ کی تحقیقات میں گزارا۔ وہ مصری اہراموں کی دیواروں پر کندہ قدیم پہیلیاں بوجھ لیتے اسی لیے انہیں علم الانسان کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ ان کے چند گراں قدر تحقیقی مقالوں کو حتمی مانا جاتا اور حکومت وقت انہیں اکثر وقتاً انعام و اکرام سے نوازتی رہتی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی رہائش شہر سے دور مضافات میں ایک ویران جگہ پر قلعہ نما گھر میں رکھی تھی۔ جہاں وہ اپنے چند وفادار ملازمین کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ان کی بیوی ایک عرصہ پہلے انتقال کر گئی تھی اس لیے وہ تنہا ایک بیٹے اور ان ملازمین کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ یہ قلعہ نما گھر ایک بہت بڑی اراضی پر تعمیر کیا گیا تھا جس میں زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں۔ گھر سے ملحق ایک بہت بڑی لائبریری اور قیمتی نوادرات سے بھرا ہوا ایک عجائب گھر بھی تھا چونکہ گھر شہر سے دور ایک ویرانے میں تھا اسی لیے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بہت ہی کم تھا ویسے بھی ڈاکٹر صاحب تنہائی پسند انسان تھے اور بیشتر وقت گھر میں ہی رہتے یا پھر لائبریری میں مطالعہ کر کے وقت گزارتے۔ رات دن، صبح و شام گھر میں ہر وقت کے سناٹے سے ہو کا عالم پھیلا رہتا اور اسی لیے گھر کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ یہ آسیب زدہ ہے۔

ڈاکٹر جوزف کا بیٹا جانسن آوارہ منش تھا۔ وہ باپ کی کوئی خبر گیری نہ کرتا بلکہ تعلیم کے بہانے شہر میں کالج ہاسٹل میں رہتا اور کبھی کبھار جب روپے پیسوں کی ضرورت ہوتی تو باپ سے ملنے چلا آتا چونکہ ڈاکٹر صاحب کو اپنی اکلوتی اولاد سے بے حد پیار تھا اسی لیے وہ اس کی ہر جائز یا ناجائز خواہش پوری کر دیتے۔ نتیجتاً اس نالائق اور بدچلن بیٹے نے ان کی تمام جمع شدہ پونجی برباد کر دی اور اب اس محل نما گھر اور عجائب گھر پر اس کی نظر تھی۔ لیکن فی الحال اس خواہش کی تکمیل میں بوڑھا باپ حائل تھا۔ آخرکار جانسن نے ایک سازش تیار کی اور جائیداد کے عوض روپیہ حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک جعل ساز دوست وکیل "کارلو" سے ساز باز کی۔

کارلو بدنام زمانہ وکیل تھا جس کے پاس بے انتہا ناجائز دولت تھی اور وہ ہر وقت اسی جوڑ توڑ میں لگا رہتا کہ اس ناجائز کمائی کو دگنا کیسے کیا جائے اور جیسے ہی جانسن نے اسے اس جگہ کے بارے میں اسے بتایا تو وہ فوراً اس پر قبضے کے تانے بانے بننے لگا۔ جانسن نے جائیداد کے کاغذات چوری چھپے باپ کی خواب گاہ سے چرائے اور کارلو کے پاس رکھوا کر ایک خطیر رقم حاصل کر لی۔

کی اس بات سے متفق تھی کہ وہ چارلس اس رقم کو وہ
کے حوالے کر دو، وہ کاغذات اسے مل جائیں گے۔
چارلس نے ادھار رقم لے کر امریکہ منتقل ہو گیا اور تم پر کہ وہ
سے مل کر بھی نہ کہہ پایا ہو گا، کرتے ہی کارلو سو
کے لیے اپنے وکیل اور دو حواریوں کے ساتھ
کی جانب چل پڑا۔

کے باہر صدر دروازے کے درمیان ایک لمبی
سے گزر کر ہی گھر کے مرکزی دروازے تک
اس وقت کارلو اپنے وکیل اور محافظوں کے ساتھ
اس وقت جھٹپٹے کا عالم تھا اور سورج غروب ہو رہا
ایک بڑی پُراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور
پرندوں کے پھڑپھڑانے کی آوازیں آتی جس سے
اور خوف کا منظر غالب تھا۔ ایسے میں کارلو نے
ہوئے مضبوط دروازے کو کھٹکھٹایا۔
دیر بعد ڈاکٹر کے پرانے خادم چارلی نے دروازہ کھولا اور
پوچھا۔ کارلو بڑی رعونت سے بولا: "ہمیں فوراً ڈاکٹر
کے پاس لے کر چلو۔" "معاف کیجیے لیکن وہ تو آج کل صاحب فراش ہیں اور
کسی سے نہیں ملتے۔" چارلی نے جواب دیا۔ "لیکن ہمیں تو ان کے
بیٹے چارلس نے بھیجا ہے کہ مطلوبہ رقم میرے باپ سے لے لو"
کہتے ہوئے کارلو کے وکیل نے وہ کاغذات چارلی کو دکھائے۔ چارلی
وہ کاغذات دیکھ کر چپ چاپ واپس چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا
اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی ہے اور وہ
آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب خواب گاہ میں انتہائی نقاہت کے عالم میں
بستر پر دراز تھے، وہ شدید علیل تھے۔ کارلو نے خواب گاہ میں داخل
ہوتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور جلدی سے مطلب کی بات پر آ
گیا۔ "مجھے پانچ لاکھ پاؤنڈ بمعہ سود ایک ہفتے کے اندر اندر چاہئیں
ورنہ تمھیں پوری جائداد میرے حوالے کرنا ہو گی اور میں نے اسی
شرط پر اتنی بڑی رقم بطور قرض حسنہ تمھارے بیٹے کو دی تھی۔" ڈاکٹر
جوزف کارلو کے اس بیان سے صدمے سے دوچار ہو گئے۔ تاہم
انھوں نے بڑے اعتماد سے اسے ثبوت دکھانے کے لیے کہا۔ کارلو
کے اشارے پر وکیل نے جائداد کے کاغذات ڈاکٹر صاحب کے

آگے رکھ دیئے۔ ڈاکٹر جوزف ایک کیبنٹ سے دوچار ہو گئے
چونک اٹھی بولی، رقم پوری ہے، ضرورت کے اس سے باہر تھا
انھوں نے اس سے کچھ وقت کی مہلت مانگی۔ "ٹھیک ہے۔ تم کو
بس ایک مہینے میں یہ جانا ہوگا، آپ کو یہ گھر خالی کرنا ہے"
کہہ کر کارلو اور اس کا وکیل وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر جوزف نے رقم حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن بے روزگار ہونے کے باعث وہ ساری جنگ ہار گئے۔ ادھر کارلو دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ چند روز میں وہ اتنی بڑی جائیداد کا مالک بن جائے گا۔

مقررہ دن ختم ہوتے ہی کارلو تن تنہا ڈاکٹر صاحب کے گھر جا پہنچا۔ چارلی اور گھر کے ملازمین نے اسے ڈاکٹر صاحب کی بیماری کے واسطے دیئے لیکن وہ ان سب کو نظرانداز کر کے کمال اطمینان سے سیدھا خواب گاہ میں جا پہنچا۔ ڈاکٹر انتہائی کمزور و نزار حالت میں بستر پر دراز تھے۔ کارلو ڈاکٹر کے پاس بیٹھ گیا اور بولا "بڈھے میں نے تمہیں ایک مہینے کی مہلت دی تھی لیکن تم اب تک یہیں کر بیٹھے رہے۔ اب نکلو یہاں سے مجھے جلد از جلد اس گھر میں منتقل ہونا ہے اور میں یہاں سے ساری کتابیں اور بت باہر پھنکوا دوں گا، ویسے بھی اس کباڑ خانے کو صاف کرنے میں بھی ایک خطیر رقم کی ضرورت ہوگی۔

ڈاکٹر جوزف کو اس قدر ہتک رویے کی توقع نہ تھی بہرکیف وہ بڑی تکلیف سے بولے "مسٹر کارلو دیکھو علم کی ان کتابوں اور جو بھی دستاویز کی بے توقیری مت کرو۔"

"بھلا میں جانے تم اور تمہارا علم مجھے اس سے کیا غرض مجھے تو یہ گھر چاہیے۔" کارلو نے متکبرانہ انداز میں ڈاکٹر کو جھڑ چلا۔ اچانک اس کی نظر عقاب کے مجسمے پر پڑی۔ وہ اٹھا اور بولا "یہ فضول سا پتھر کا مجسمہ تم نے کہاں سے لیا، یقیناً کسی کھدائی کے دوران ملا ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے وہ مجسمہ پوری طاقت سے زمین پر پٹخ دیا جس سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر نے ایک دلدوز چیخ مارتے ہوئے کہا "ظالم انسان ــــ یہ تم نے کیا کیا ہے؟ اس مجسمے نے تمہارا کیا بگاڑا تھا ...... تم نے یہ عمل کر کے اپنی بدبختی کو دعوت دی ہے۔" ہا ...... ہا ...... ہا ...... کارلو نہیں، کیبنٹ میں چلاؤ۔" یہ گھر، ساز و سامان اس کی ایک ایک چیز میری ہے ــــ اب تم اپنا بوریا بستر سمیٹو اور یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ ہا ...... ہا ...... ہا" یہ کہتے ہوئے کارلو نے دروازہ زور سے بند کیا اور باہر نکل گیا۔ راہداری میں گھپ اندھیرا تھا، بس دیوار پر ایک شمع روشن تھی۔ جس کی روشنی میں اسے دو سائے نظر آئے۔ کارلو پر اس وقت ایک انجانا سا خوف طاری ہونے لگا تھا۔ جب اس نے غور سے دیکھا تو اسے ڈاکٹر کے ملازم چارلی اور پہریدار وکٹر نظر آئے۔ وہ قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "چلو جاکر بڈھے کو پٹی باندھو" اور جلد از جلد یہ گھر خالی کردو۔" یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنستا ہوا راہداری سے نکل کر ایک بڑے ہال کمرے میں آ گیا۔ اچانک ہی ہال کمرے کے قمقمے روشن ہو گئے اور چھت پر لگا فانوس تھرتھرانے لگا۔ کارلو نے جونہی نظر اٹھا کر اوپر دیکھا تو فانوس ایک دھماکے سے فرش پر آن گرا اور چکنا چور ہو گیا۔ شیشے کے کئی ٹکڑے اسے بھی لگے جس سے کارلو کے اوسان خطا ہو گئے۔ دھماکے کی آواز سن کر چارلی اور وکٹر بھاگتے ہوئے آئے۔ انھیں دیکھتے ہی کارلو گرجا "میں جانتا ہوں یہ سب تمہاری کارستانیاں ہیں۔ فکر مت کرو کل تم سب لوگ سڑک پر ٹھوکریں کھا رہے ہو گے۔" کارلو غصے میں آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا لیکن اندر سے اسے اس بات کا گمان تھا کہ یہ گھر آسیب زدہ ہے اور شاید اسی لیے ڈاکٹر سے میرے بے رحمانہ رویے پر آسیبی طاقتیں میرے لیے رکاوٹ بن رہی ہیں۔

کچھ دیر بعد وہ گھر سے باہر نکل چکا تھا۔ ایک انجانے خوف کی لہریں اس کے اعصاب پر ڈیرے جما چکی تھیں۔ وہ جلد از جلد اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ باہر مکمل اندھیرا تھا لیکن چاند کی چاندنی میں اسے کچھ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اسے ایسے لگا جیسے اس کے پیچھے چرند پرند سائے بھاگتے چلے آ رہے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے وہ پل پر پہنچ گیا اور دم لینے کے لیے ذرا رکا۔ ہر طرف مکمل سکوت تھا کہ اچانک فضا میں ایک خوفناک چیخ سنائی دی۔ خوف سے اس نے نظریں اوپر اٹھائیں تو اسے ایک بڑا عقاب نظر آیا جو اس پر حملہ آور ہونے کے لیے پر پھیلا رہا تھا۔ یہ عقاب اس مجسمے والے عقاب سے مشابہ تھا جس کو کارلو نے بلاوجہ انتہائی بے دردی سے توڑ دیا تھا۔ کارلو نے اپنی پوری طاقت مجتمع کر کے بھاگنے کے لیے

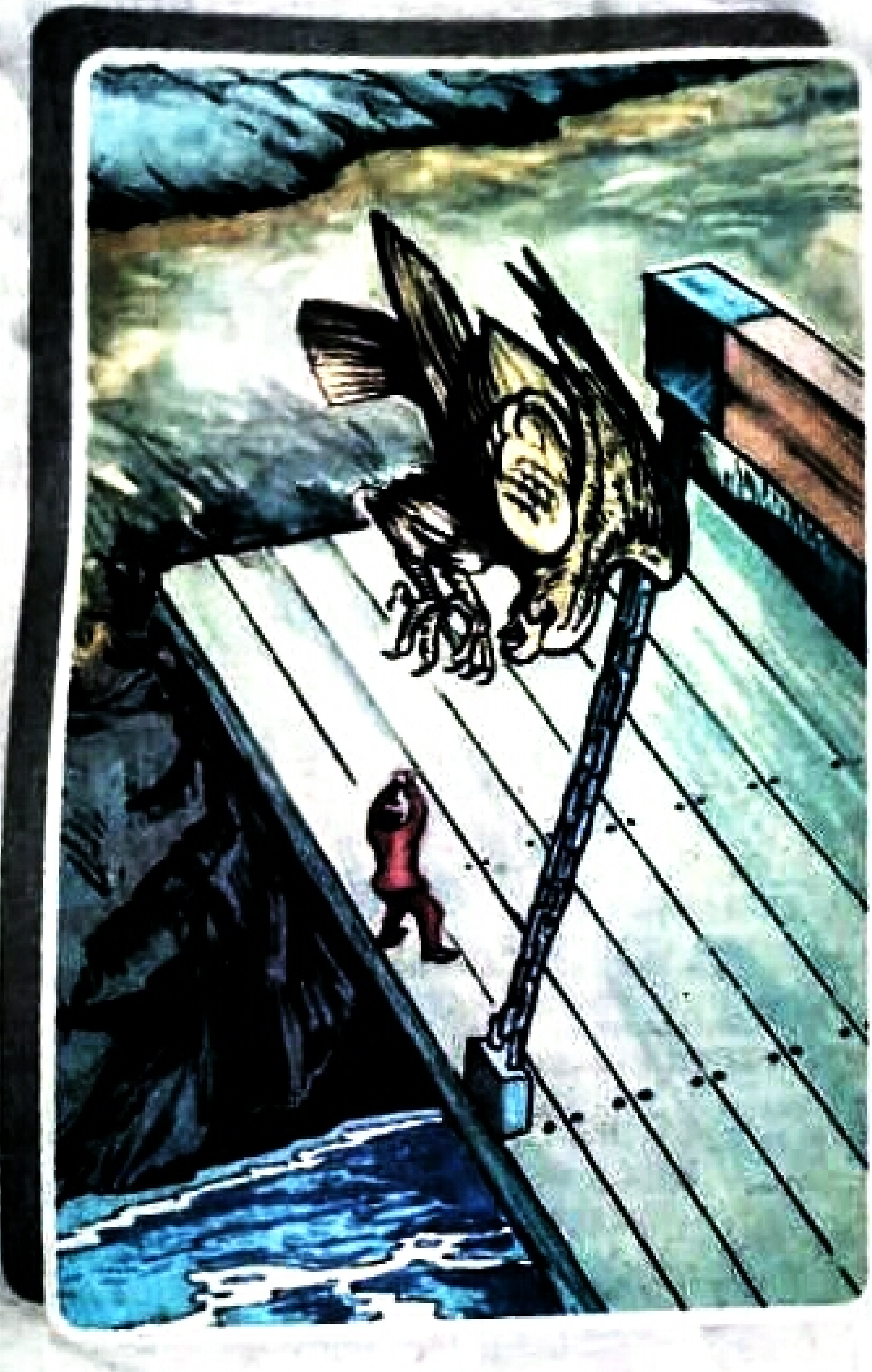

سے نکلی تو اس نے عقاب نے فضا میں غوطہ لگا کر کارلو پر حملہ کیا۔

کارلو نے اپنے آپ کو اس کے خونخوار پنجوں سے بچانے کے لیے پل پر سے ندی میں چھلانگ لگا دی۔ یخ بستہ پانی میں غوطہ لگاتے ہی اس کا جسم سن ہو گیا۔ سانس لینے کے لیے جونہی اس نے اپنا سر پانی سے باہر نکالا تو عقاب نے اپنے تیز نوکیلے پنجے اس کے سر پر گاڑ دیے۔ کارلو نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن عقاب نے اپنی چونچ اور پنجوں سے اس کا حلیہ بگاڑ دیا اور کارلو کو اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اس کی سانس باقی نہ رہی۔ اور یوں کارلو کا قصہ تمام ہوا۔

ادھر مکان میں دونوں ملازم ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچے تو ڈاکٹر نے انتہائی نحیف آواز میں ان سے کہا کہ وہ زمین پر پڑے شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اکٹھے کر کے مرتبان میں ڈال دیں۔ ٹکڑے اٹھاتے ہوئے چارلی نے جونہی عقاب کا ٹوٹا ہوا سر زمین سے اٹھایا تو اسے اس کی چونچ پر خون کا تازہ دھبہ نظر آیا اور سر بھی گیلا لگا جیسے ابھی ابھی پانی سے نکلا ہو۔ چارلی کی ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی۔ لیکن ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "ڈرو نہیں یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا اس نے اپنا انتقام لے لیا ہے۔" ☆☆☆